واقعاتِ انیس
فردوسی ہند جناب انیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ کی سوانح عمری
میر مہدی حسن احسنؔ لکھنوی

ڈاکٹر سید صفدر حسین

تخلیقات

آئینِ وفا (مرثیہ در حالِ حضرتِ عباسؑ)
جلوۂ تہذیب (مرثیہ در حالِ حضرت علی اکبرؑ)
چراغِ مصطفوی (مرثیہ در حالِ حضرت امام حسینؑ)
مقامِ شبیری (ایضاً)
مرثیہ بعدِ انیس (تنقیدی جائزہ)
شاہکارِ انیس (میر انیسؔ کی رزمیہ شاعری)
کاروانِ مرثیہ منزل بہ منزل (تاریخی و ادبی جائزہ)
ساداتِ بارہہ تاریخ کے مدّوجزر میں (تاریخ)
لکھنؤ کی تہذیبی میراث
لکھنؤ کی ادبی میراث
رقصِ خیال (تازہ نظموں کا مجموعہ)
نگارِ غزل (مجموعۂ غزلیات)

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

واقعاتِ انیس

(فردوسیِ ہند جنابِ انیس اعلی اللہ مقامہٗ کی سوانح عمری)

میر مہدی حسن احسن لکھنوی

سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار، لاہور

تعداد — ایک ہزار

سالِ طبع — ۱۹۷۴ء

کتابت — تمکین شیرازی

مطبع — منظور پریس لاہور

ناشر — سیّد ابرار حسین

قیمت — ۱۵ روپے

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب کی تالیف کا آغاز بقولِ مؤلّف، میر انیسؔ کی وفات کے بتیس ۳۲ سال بعد یعنی ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا۔ تین سال بعد یہ تالیف مکمل ہوکر ۱۹۰۸ء میں اصح المطابع، لکھنؤ سے طبع ہوگئی تھی۔ اس کے مسودے پر نظرِ ثانی سید علی محمد عارفؔ زیدی الواسطی، نبیرۂ میر خورشید علی نفیسؔ نے کی تھی، جو اُس وقت میر انیسؔ کے خاندانی روایات کے محافظ تھے۔
کتاب کا پہلا ایڈیشن حامد علی خان بیرسٹر کے نام سے معنون ہوا تھا۔ حامد علی خان، جن کے خاندانی حالات، شمس التواریخ میں درج ہیں، قصبہ امروہہ ضلع مُراد آباد کے ایک کنبوہ گھرانے کے فرد تھے۔ اُنہوں نے انگریزی اور اُردو زبان میں متعدد علمی مضامین لکھے اور نظم و نثر میں اپنی کئی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ آپ نے انگلستان سے فراغتِ تعلیم کے بعد بیرسٹری کے لئے لکھنؤ میں اقامت اختیار کرلی تھی اور پھر اُسی شہر میں ترقّی و شہرت کے تمام مدارج طے کرکے علمی، ادبی اور تہذیبی حلقوں میں اپنے لئے وہ ہر دلعزیزی پیدا کرلی تھی کہ لکھنؤ کے معروف عالمِ دین جناب مولانا حامد حسین اعلی اللہ مقامہٗ مہینے میں کم از کم ایک بار آپ سے مِلنے کے لئے آپ کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے اور یہ روایت بھی لکھنؤ میں خاصی مشہور تھی کہ ایک بار میر خورشید علی نفیسؔ فرزند میر انیسؔ نے بھری مجلس میں منبر سے حامد علی خان کو مخاطب کرکے فرمایا تھا کہ مجلس میں آپ کا تشریف رکھنا مَیں دادِ کلام کے لئے دوہزار آدمیوں کے مقابل جانتا ہوں۔
مؤلّفِ کتاب کا نامِ نامی سید مہدی حسن اور تخلص احسنؔ تھا۔ آپ لکھنؤ کے ایک باعزّت گھرانے سے تھے۔ آپ کے والد میر حسن علی، لکھنؤ کے شاہی عہد میں،

کسی ممتاز عہدے پر فوج میں ملازم تھے، اور آپ کے دادا میر نثار علی بھی اودھ کی شاہی فوج میں کمیدان تھے۔

مؤلفِ مذکور کا ننھیالی تعلق حکیم نواب مرزا شوقؔ، صاحبِ مثنوی "زہرِ عشق" و "بہارِ عشق" کے خاندان سے تھا۔ یعنی مہدی حسن کے حقیقی نانا حکیم آغا حسن تخلص ازلؔ تھے جو نواب مرزا شوق کے بھائی تھے۔

احسنؔ نے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم لکھنؤ ہی میں مشرقی انداز پر پائی تھی لیکن حسبِ ضرورت انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ آپ مشرقی و مغربی علوم سے واقفیت کے باعث ہفت زبان کہلانے کے مستحق تھے۔ موسیقی سے بھی آپ کو کچھ لگاؤ تھا اور اس فن میں بھی خاصہ درک رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں فنِ سپہ گری میں بانک، پٹا اور بنوٹ خوب جانتے تھے۔

احسنؔ نے جب شاعری شروع کی تھی تو آغا علی شمسؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا لیکن مذہبی نوعیت کی شاعری مثلاً مرثیہ، قصیدہ، سلام اور رباعیات وغیرہ پر آپ میر خورشید علی نفیسؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ مرثیہ گوئی سے زیادہ مرثیہ خوانی کے دلدادہ تھے اور اس فن میں بھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔

مشق و مہارت کے بعد ترقی کر کے آپ نے عاشقانہ انداز میں جو غزلیں کہی تھیں اُن میں بقولِ مؤلفِ خمخانۂ جاوید "عاشقانہ راز و نیاز کے ساتھ اخلاقی پہلوؤں کو خوبی سے نباہا ہے۔ اشعار ولولہ انگیز و دل نشین و معنی خیز ہوتے ہیں"۔ نمونۂ کلام کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

لذّتِ درد کی مشتاق رہی جانِ حزیں — دل کا دشمن تھا وہ ناوک جو دل آزار نہ تھا

کہاں تک روئے گا اے جینے والے مرنے والوں کو — کچھ اپنی فکر کر تجھ کو پرائے غم سے کیا مطلب!

ملے جو خاک میں اُن پر فشار ہوتے ہیں — زمیں کے دل میں بھی کیا کیا غبار ہوتے ہیں

ہے یہ حسرت کہ وہ دریافت کریں اور میں کہوں — آپ مرے پوچھنے والے مرا حال اچھا ہے
زینتِ دامنِ قاتل ہیں لہو کے آنسو — دلِ خوں گشتۂ عاشق کا مآل اچھا ہے
تم ملے ساری خدائی مل گئی — جس کے تم ہو اُس کو کیا درکار ہے
راہ چلنی ترے کوچے میں بہت مشکل ہے — کیا رکھوں پاؤں کہ ایک ایک قدم پر دل ہے
بے ترے سیرِ چمن ہے مجھے اندوہ فزا — خندۂ گل میں بھی آوازِ شکستِ دل ہے
ہے شبِ ہجر مرے گھر میں عجب سناٹا — کہ سرِ شام سے خاموش چراغِ دل ہے
دم گلے مل کے چلے ختم ہوئی وصل کی رات — شمع خاموش ہے بجھنے کو چراغِ دل ہے
لذتِ درد کو ہم سے کوئی پوچھے احسن — اللہ اللہ کہ ہر عضوِ بدن اک دل ہے

مہدی حسن احسنؔ لکھنوی اردو ادب میں ڈراما نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ ڈراما نویسی سے ان کے لگاؤ کا قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں اُن کے مکان کے قریب "افضل محل" نام کی ایک حویلی تھی جس میں انیسویں صدی کے آخری زمانے میں بمبئی کی بعض ناٹک کمپنیاں آکر ٹھہرتی اور ڈرامے پیش کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ داراب شاہ کی کمپنی آئی ہوئی تھی، جس نے منشی الف خاں حباب فتح پوری کا لکھا ہوا ڈراما "عزرالماہرو" پیش کیا تھا۔ اس ڈرامے کو دیکھ کر مہدی حسن احسنؔ کے دل میں ڈراما تصنیف کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے ۱۸۹۷ء میں اپنے رشتے کے نانا نواب مرزا شوق لکھنوی کی مشہور مثنوی "زہرِ عشق" کے قصے کو "دستا ویزِ محبت" کے نام سے ڈرامے کی صورت میں منتقل کر کے داراب شاہ کو دے دیا تھا۔ اس ڈرامے کی پہلی پیش کش لکھنؤ ہی میں ہوئی تھی۔ اس کی مقبولیت نے احسنؔ لکھنوی کے دل میں ڈراما نگاری کے لئے مزید ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے سات آٹھ سال کے عرصے میں کم و بیش ایک درجن ڈرامے لکھے جن میں سے پانچ شیکسپیئر کے مشہور ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ احسنؔ کے ڈراموں میں زبان کی صفائی اور محاورے

کی پابندی کے ساتھ موسیقی کی خوش آئند دُھنوں میں ہر قسم کے مطالب و مضامین بیان ہوئے ہیں۔ وہ چونکہ تھیٹریکل کمپنیوں کے ساتھ ملک کے مختلف شہروں میں جاتے اور وہاں کے ادبی مذاق رکھنے والے شرفا سے ملتے رہتے تھے اس لئے لکھنؤ کے دوسرے پختہ فن شعرا کے مقابلے میں انہیں زیادہ شہرت حاصل ہو گئی تھی۔

اُن کی ڈراما نویسی کا دَور ۱۸۹۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۰ء تک عروج پر رہا۔ اس کے بعد اُن کا قیام زیادہ تر لکھنؤ ہی میں نظر آتا ہے۔ آپ کو خاندانِ انیسؔ کی شاگردی اور اُس سے رشتۂ مصاہرت پر فخر تھا۔ اسی جذبے کے تحت آپ نے میر انیسؔ کے حالات صحتِ واقعات کے ساتھ ترتیب دینے کا اہتمام کیا تھا" واقعاتِ انیسؔ" کی ترتیب کا کام ۱۹۰۵ء میں شروع ہوا تھا اور تقریباً تین سال بعد ۱۹۰۸ء میں یہ کتاب مکمل ہو کر شائع ہو گئی تھی۔

"واقعاتِ انیسؔ" ایک مدت سے کمیاب تھی اس لئے یہ مناسب نظر آیا کہ میر انیسؔ کی "صد سالہ یادگار" کے موقع پر اسے دوبارہ شائع کرا دیا جائے۔ چنانچہ کتابت کی بہت سی غلطیوں کو دُور کر کے اس کا دوسرا ایڈیشن پیشِ خدمت ہے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین

راولپنڈی۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء

اہلِ قلم ہوں یا اہلِ سیف جب اُن کی آنکھیں بند ہوگئیں اور موت نے اُن کے قوے بے کار کر دیئے تو افرادِ انسانی سے بہت سے خدا کے بندے پیدا ہوگئے جنھوں نے اُن کے کارہائے نمایاں کو ضائع نہ جانے دیا اور اپنے مُبارک ہاتھ اُن کے کمالوں کی اشاعت میں مصروف کر دیئے تاکہ اُن کے بعد آنے والی نسلوں کی نگاہوں سے بزرگانِ قوم کی حیرت انگیز ترقیاں پوشیدہ نہ رہیں۔ یہ طریقہ مغربی اہلِ قلم میں عموماً اور ایشیائی تعلیم یافتوں میں خصوصاً پایا جاتا ہے اور اسی بُنیاد پر مغرب کے کاملوں کی فہرست ایشیا کے اہلِ کمال سے زیادہ لمبی چوڑی نظر آتی ہے۔ مغرب میں کسی کامل الفن کی سوانح عُمری لکھنے کا طریقہ موجُودہ نسل کی ترقی کا سبب سمجھا جاتا ہے اور ایشیائی شاعر اپنے ہم عصر اہلِ کمال کی موت پر صرف افسوس ظاہر کرنے کے بعد بالکل خاموش ہو جاتے ہیں یا تاریخِ وفات کا ایک مصرعہ لکھ کر اپنے فرائض سے سُبکدوشی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ کمال کے کمالات کی تصویریں

دُھندلی ہوتے ہوتے بالکل بے آب ورنگ ہو جاتی ہیں اور تھوڑے ہی زمانے کے بعد صفحۂ ہستی پر محض ایک سادہ ورق رہ جاتا ہے جس طرح دریا کی طوفانی موجیں ایک دُوسرے کا نشان مٹاتی چلی جاتی ہیں اُسی طرح انقلابِ زمانہ مشاہیر ہند کے نام و نشان مٹا رہا ہے۔ ہماری قوم کی کم ہمتی اور کوتاہ قلمی سے کسی کامل کی تاریخ دستیاب نہیں ہو سکتی جو متوفی کے حالات پر پوری روشنی ڈال سکے۔ بزرگانِ قوم اور صاحبانِ علوم و فنون کے فنا ہو جانے پر موجودہ نسل اُن کے بقائے دوام کا سلسلہ توڑ دیتی ہے اُسی لگاؤ میں جب کہ مرجانے والے کے غمِ فراق کا اثر تمام اندرونی قوتوں کو جُنبش دے رہا ہو قومی ہمدردی کے جذباتِ کامل سے کام لیا جائے تو تاریخ کے صفحاتِ زرّیں پر مشاہیرِ ہند کے نام نامی آفتابِ محشر کی طرح جگمگاتے نظر آئیں گے اور وہ حیرت انگیز ترقیاں جو بقائے عناصر تک محدود تھیں کاغذی دُنیا کی آبادی میں تا ابدالآباد محفوظ رہ سکتی ہیں۔ اہلِ قلم کی کوششوں سے واقعاتِ ماضیہ کی تجدید کچھ دُشوار بات نہیں ہے۔ حادثات اور سوانح کے یادگار قائم رکھنا ایک ایسا ضروری مسئلہ ہے کہ جب فنِ کتابت مروّج نہ تھا تو سنگین اور قابلِ قدر واقعات دماغ میں محفوظ کئے جاتے تھے۔ جب قوّتِ حافظہ بھی اُس کی حفاظت کے لئے ناکافی قرار پائی تو فرضی نقوش کی ایک ترکیب مصری یا چینیوں نے اختراع کی۔ جس سے ادائے مطالب کے لئے مختلف اشکال سے مدد لی جانے لگی۔ اب ہمارے وقت میں کچھ مشکل نہیں ہے کہ ہم کسی واقعے کا خاکہ قوّتِ متخیلہ کی مدد سے اپنے دماغ میں اُتار لیں اور پھر ضرورت کے وقت اپنے قلم کی زبردست قوّت سے اُس میں تشریح اور توضیح کا رنگ بھر دیں۔ ایسے اسباب و آلات موجود ہونے پر ہماری کاہلی اور سہل انگاری کچھ نہیں کرنے دیتی۔ یہ قومِ اسلام کے لئے ایک قابلِ افسوس بات ہے۔

دُنیا میں اس وقت جس قدر معروف و مشہور آثار و اذکار ہیں اُن سب کو شرفِ تاریخی صفحوں سے ملا ہے اگر قلم اپنی زبان بند رکھتا اور مؤرخ خاموش رہتے تو قصرِ حمراء و قصرِ بیضا

آثارِ مصر و دیوارِ خطا کے عجائبات سے کوئی واقف نہ ہوتا۔ والمک، کالیداس، شیکسپیر، ملٹن، بیکن، ہومر وغیرہ کے کمالوں کی مبہم تصویریں تاریخ ہی کے فریم میں جڑی ہوئی ہیں اور تاریخ ہی کے آئینہ میں نظر آتی ہیں۔ رستم جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے فقط حکیم ابوالقاسم فردوسی کے زورِ قلم سے ایک اعجازی قوت کا مالک بن گیا جو اب تک شعرا کے قصائدِ مدحیہ میں مشبہ بہ کا کام دے رہا ہے۔ مرجانے والوں کے کمالوں پر گمنامی کا پردہ نہ ڈالو ورنہ امتدادِ زمانہ ان کے ساتھ ان غیر فانی جوہروں کو بھی فنا کردے گا جو وہ اپنے بعد اہلِ دنیا کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ مغرب ہی کی سرزمین کو قدرت کی جانب سے یہ شرف حاصل ہے کہ اس خاک سے پیدا ہونے والے جنہوں نے اپنے مرکزِ اصلی کی جانب رجوع ہونے کے بعد اپنے کمالات کے افسانے آبِ زر سے لکھنے کے لئے چھوڑے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مردم خیز خطے کو بھی یہ فخر بخشا گیا ہے کہ اس خاکِ پاک سے بڑے بڑے مشاہیرِ عالم آسمانِ علم و کمال کے آفتاب بن کر چمکے اور آج وہی خاک ان کی آرام گاہ ہے۔ اس خاک میں وہ بیش بہا جواہر چھپے ہوئے ہیں جو کبھی سلاطین باعظمت و شان کے تاجِ سلطنت کے زیب و زینت تھے اور گلزارِ عالم میں نسیمِ سحر کی طرح پژمردہ دلوں کی کلیاں شگفتہ کر گئے مگر آج وہ خاموش ہیں اور قومِ اسلام کے طبقۂ آخر کے اہلِ قلم نے ان کے حالاتِ زندگی پر گمنامی کا پردہ ڈال دیا ہے۔ محنت کش مزدوروں کے پھاوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ ہندوستان کے پرانے کھنڈروں سے کتابِ تاریخ کے بوسیدہ ورق نکل آتے ہیں جو مکین و مکان کا پتہ بتا رہے ہیں مگر کوئی توجہ اس جانب مائل نہیں ہوتی۔

دنیا کی کوئی بھری سے بھری انجمن ایسی نہ ہوگی جس کو شہرِ خموشاں کے باشندوں پر رشک نہ آتا ہو۔ گو وہ خاموش ہیں مگر ان کی خاموشیوں میں رنگا رنگ ترانہ سنجیوں کا مزا ہے۔ ان کے قوا آج معطل ہیں مگر ان کی حیرت انگیز ترقیاں اب تک اپنا کام کر رہی ہیں۔ سطحِ زمین سے چند ہاتھ نیچے ایسے بہت سے خزانے گڑے ہوئے ہیں جو اپنے فیضانِ ہنر سے دنیا کو

مالامال کر گئے اور آج بھی اُن دفینوں پر تاریخِ وفات کی مُہریں لگی ہوئی ہیں۔ کسی ویران قبرستان کی طرف نکل جاؤ اور کسی تاریخِ مزار کا کتبہ پڑھا تو بے ساختہ تمہاری زبان سے نکل جائے گا۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

صدیوں کا فاصلہ جو سدِّ راہ ہے خیال اُس کو طے کرنے میں کمالِ سُرعت سے کام لیتا ہے آخر عِلم وہُنر کی اُس دُنیا میں آرزوئے مُلاقات پُوری ہو جاتی ہے جہاں اُن کی تصانیف کی زبردست یادگاریں امیدواروں کو اپنی جانب بُلا رہی ہیں۔ مقدّس مزاروں کے سونے والوں پر خدا کی رحمت سایہ گُستر ہے اُن کی یاد ہمارے دل میں ہمارے جگر میں خون کی طرح دَورہ کر رہی ہے۔ وہ اِس قابل ہیں کہ اُن کو یاد رکھو اور یاد رکھنے کے لیے بہترین طریقِ عمل یہ ہے کہ اُن کے واقعاتِ زندگی اور معلوماتِ علمی کو کاغذی دُنیا کی سیر گاہ بنادو کہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی اُس سے فائدہ اُٹھائیں۔ مخلوقاتِ عالم میں شاعر ایک خاص ہستی ہے اور اُس کا دماغ رنگارنگ خیالات کا خزانہ۔ وہ خدا کی زمین و آسمان کا مالک اپنی شاعری کی دُنیا میں کسی چیز کا محتاج نہیں اور اُس کا مستغنی دِل کائنات کی بیش بہا اجناس کو لُٹا کر افسوس نہیں کرتا۔ اجرامِ فلکی اُس کے تابع موالیدِ ثلاثہ اُس کا مصرف نظامِ عالم اُس کے قلم کی ایک گردش، وہ اپنی خواہشیں پُوری کرنے کو نہ دولت مندوں کا دست نگر نہ بادشاہوں کا منت کش اُس کے فیاض ہاتھ ہمیشہ عِلم و ہُنر کا خزانہ لُٹانے کو تیار رہتے ہیں۔ بادشاہانِ جلیل القدر کے درباروں کی عظمت و جبروت تو ایک خاص عہد تک محدود رہتی ہے مگر یہ اقلیم کاغذی کے شہنشاہ اپنی زبردست مملکتِ علم و ہُنر کو تا قیامِ قیامت یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔

(ویسٹ منسٹر ابی) جس کی چپہ چپہ زمین پر شاہانِ لندن کی آرام گاہیں بنی ہیں اور اُس خاموش آبادی میں بڑے بڑے اہلِ کمال کا مجمع ہے کسی حصّہ میں سلاطینِ گردن کش و دشمن کُش کی انجمن ہے اور کہیں تلوار کے وہ دھنی بلی ہیں، جن کی معرکۃ الآرا نبرد آزمائیوں نے روم و شام کے عرصۂ مصاف پر لہو کے دریا بہادیئے اور پھر موت کی مجبوری نے اُن کو گوشۂ عزلت میں

گہری نیند سُلا دیلے وہاں بھی سب سے زیادہ قابلِ قدر و تعظیم وہ اہلِ قلم ہیں جنہوں نے اپنے علوم کی روشنی سے موجوداتِ عالم پر ایسی غائر نظر ڈالی جس سے فلسفۂ قدرت کے اہم مسائل حل ہو گئے اس لئے شعراء اور مصنّفین کے مدفن ادب کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہندوستان تو آج اس بات سے بھی مجبور ہے اور مشاہیرِ ہند کے مقدس مزاروں کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ ہم جس عظیم الشان قبرستان کا ذکر اُوپر کر آئے ہیں وہاں بادشاہوں کی قبر پر تو

لہ میں لکھنو کا رہنے والا ایک مدت سے سُنتا تھا کہ ناسخ مرحوم کی قبر محلہ ٹکسال میں ہے اور ٹکسال کا محلہ خاص چوک میں واقع ہے۔ ایک روز خیال ہوا کہ اس مقدس بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھو لہ ٹکسال میں داخل ہوا۔ ایک کوچۂ تنگ و تاریک میں پہنچ کر دریافت کیا کہ ناسخ مرحوم کی قبر کہاں ہے ایک صاحب نے ایک منہدم چار دیواری کی طرف اشارہ کیا۔ اندر جا کر دیکھا تو ایک کھنڈر تھا اور چند بیل اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ بیلوں کے فضلے سے مقام نہایت متعفن ہو رہا تھا اور قبر کا نشان زمین دوز ہو کر مٹ گیا تھا۔ ایک شخص گنوار جو یقینی قوم کا اہیر اور اُن بیلوں کا مالک تھا اُس سے دریافت کیا کہ کیوں بھائی یہاں ناسخ کی قبر کس مقام پر ہے اُس نے ایک حصۂ زمین کی جانب ایسا اشارہ کیا جس سے کمال بد مزاجی اور بے اعتنائی پائی جاتی تھی اور زیادہ جرح کی ہمت نہ پڑی اور اُسی اشارہ پر فاتحہ پڑھ دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اسی طرح ایک مرتبہ دل میں خیال آیا کہ میر تقی میر مرحوم کی قبر دریافت کرنا چاہیئے۔ پُرانے لوگوں سے معلوم ہوا کہ میر صاحب کی قبر بھیم کے اکھاڑے پر ہے۔ یہ محلہ عہدِ شاہی میں بہت مشہور تھا اور اب وہاں سوائے کھنڈروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ آغا میر کی ڈیوڑھی سے ریلی گارو کے نیچے نیچے تک اسی محلہ کا سلسلہ گیا ہے۔ راستہ میں ایک بہت پرانا تکیہ ہے جس کو سیتاپور کی جدید ریلوے لائن نے کاٹ کر قبروں کو متفرق و پاشان کر دیا ہے بیچ میں ایک سڑک گھوڑے گاڑی کے لئے ہے اُس کے اُوپر پلتا ہے جس پر سے ریل گزرتی ہے۔ تکیہ کے کئی حصے ہو گئے ہیں۔ ایک ریلوے لائن کے بغل میں ہے اور دوسرا اُس کے مقابل میں اور تیسرا مشرق کی جانب کسی قدر فاصلے پر واقع ہے مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت میں یہ ایک ہی تکیہ ہوگا (دیکھو صفحہ آئندہ)

کوئی حُسنِ عقیدت سے پھُول چڑھانے نہیں آتا مگر چارلس ڈکینز کی قبر پر ایسے پھولوں کے انبار آج بھی دکھائی دیتے ہیں جن کی خوشبو تمام مزاروں کو فیض پہنچا رہی ہے اور اب بھی اُس کی ذات سے اُس کے ہمسایہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ بردلعزیزی بیش بہا جنسِ کمال کا نتیجہ ہے۔ ٹینسن اور مکالے اپنی شہرتِ علمی سے ہنستے بولتے نظر آتے ہیں اور بہت سے سلاطین

(بقیہ صفحہ گزشتہ) جس کو نئے جغرافیہ نے متغرق کر دیا۔ بہرکیف وہاں تک پہنچا ہگر مجبور تھا کہ کس سے دریافت کروں۔ اوّل تو شہر کا غیر آباد حصہ جہاں انسان کا گذر بھی اتفاق سے ہو جاتا تھا اور اگر کوئی شخص ملا بھی تو میرے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ میں نے تینوں قبرستانوں کو چھانا گرمی کی فصل اور دوپہر کا وقت تھا۔ لُو چل رہی تھی اور یہاں میر صاحب کی محبت دل میں امنگ پیدا کر رہی تھی۔ میں عالمِ خیال میں پکار رہا تھا۔ میر صاحب بھلا کب کسی کی سنتے ہیں۔ خدا جانے کس مضمون کی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ کچھ آواز نہ آئی۔ بے نیلِ مقصود واپس ہوا کئی سال کے بعد اتفاقیہ اُس طرف گذر ہوا۔ شام کا جھٹ پٹا وقت تھا تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں گاڑی پر سوار تھا۔ دہنے بائیں دونوں جانب۔ بیہڑ میدان اور چند کھیتوں کے سوا کچھ نہ معلوم ہوتا تھا۔ دہنی جانب کی بلندی پر جہاں اِس قبرستان کا ایک حصہ باقی ہے کسی انسان کی پرچھائیں سی معلوم ہوئی۔ مجھ شوریدہ مزاج کو ایسے مقاموں سے دلچسپی ہے گاڑی روک لی اُتر پڑا اور ایک ناہموار بلندی کا راستہ طے کرکے ایک قبر کے سرہانے پہنچا تو ایک نیک بخت ضعیفہ کو اُس قبر پر جھکے ہوئے اور حصولِ مدعا کے لئے دعاؤں میں مصروف پایا۔ سناٹے کے عالم میں ایک پیرزال کا قبرستان میں گذر حیرت ناک واقعہ خیال کرکے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہو گیا کہ آج وہ رازِ سربستہ کھُلا جاتا ہے۔ دل کڑا کرکے اُس ضعیفہ سے سوال کیا کہ اس سناٹے کے وقت تم اس قبرستان میں کیا کر رہی ہو اور یہ قبر کس کی ہے جس پر تم جھکی ہوئی ہو۔ وہ بے چاری سہم گئی اور کچھ جواب نہ دیا مگر خدا میرے اُس گناہ کو بخشے کہ میں نے بے ضابطہ دھمکیاں دے کر حال دریافت کیا۔ اُس بے چاری غریب عورت نے جواب دیا کہ یہ قبر ایک میرے مورثِ اعلیٰ کی ہے اور وہ ایک درویش صفت سید تھے۔ (دیکھو صفحہ آئندہ)

ایسے ہیں جن کی شہرت بھی اُن کے اجسامِ مُردہ کی طرح اُسی چار دیواری میں دفن ہے۔ ملکہ الزبتھ قبرستان کے جس گوشے میں سو رہی ہے اُسی کے قریب اڈیسن بھی خوابِ راحت میں ہے۔ کوئن کا اقبال لوحِ قبر سے ثابت ہو کہ نہ ہو مگر اڈیسن کے تعویذِ مزار سے آج بھی علمی شعاعیں نکل نکل کر مغرب سے مشرق تک اپنا نور پھیلا رہی ہیں۔ نادانوں کے خیال میں شاعری فعلِ عبث اور نظامِ شاعری سعیِ لاحاصل ہے مگر اہلِ علم کے نزدیک شاعری اظہارِ علوم و فنون کا آلہ ہے۔ نظم سے انسانی طبیعتوں کو گہرا تعلق ہے اور مسائلِ علمیہ یا جذباتِ صادقہ کو سلسلۂ نظم میں مسلسل کرنے سے ذہن کو ایک خاص لذت ملتی ہے اور وہی لذت قوتِ متخیلہ کو متحرک کرتی ہے اور اسی حرکت سے خیالات میں نشو و نما پیدا ہوتا ہے اور یہی جذبات مضامینِ علمی کو نظم کر کے قالب میں ڈھلتے ہیں اور یہی نظم انسانی شہرت کا ذریعہ ہے اور یہی شہرت بقائے دوام و حیاتِ جاوید کا باعث بناؤ علیہ ایک زمانے میں میرے پاس متواتر خطوط آئے اور ملک کا تقاضا ہوا کہ میں میر انیسؔ کی سوانح عمری لکھوں۔ مگر کہاں یہ ہیچمدان احسنؔ اور کہاں اِس کارِ اہم کے فرائض۔ افسانہ نگاری اور واقعاتِ تاریخی میں فرق بیّن ہے۔ تذکرہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) میرا باپ جب کبھی کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا تھا تو اِس صاحبِ قبر سے استدعا کرتا تھا۔ اُسی طریق کے موافق میں بھی اپنی مشکلوں میں اکثر اِس صاحبِ قبر سے امداد طلب کرتی ہوں۔ میں نے پوچھا ان کا نام کیا ہے۔ اُس نے کہا نام میں نہیں جانتی مگر اتنا جانتی ہوں کہ اگلے زمانے میں ایک مشہور شاعر تھے۔ اہا۔ کیا خوشی کی بات تھی۔ مجھ پر ایک عالمِ وجد طاری تھا اور اُس بے خودی میں بکمال عقیدت سر قبر پر فاتحہ کو جھکا عورت نے اپنا راستہ پکڑا۔ گاڑی والا چلا چلا کر پکار رہا تھا۔ اُس کرییہ آواز سے ہشیار ہوا تو موقع نکل گیا تھا۔ میں نے تو اپنے دل سے اُس مزار کو میر مرحوم کا مزارِ مقدس طے کر لیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے ۔۔۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یا تاریخ کا جادہ راستی اور راست بازی ہے۔ قصّہ اور ناول کا معیار مبالغہ اور صنائع شاعری ہے۔ راویِ منصف اور عادل کی قید تصنیف کو رنگینیِ خیالات اور مضامین آفرینیوں سے محروم رکھتی ہے نہ تشبیہہ و استعارات کو دخل ہے نہ تصرفِ شاعرانہ کو تعلق۔ آخر کار میری عمر کی اکثر خوشگوار راتیں اس فکر میں بسر ہونے لگیں مگر تمام خیالات ایک خوابِ پریشان کی حیثیت سے رات ہی بھر میں فنا ہو جاتے تھے اور صبح کو اُس کی تعبیر صرف ایک ناکامی کے لفظ سے بل جاتی تھی۔ اور مدت سے یہ بھی سُن رہا تھا کہ ہندوستان کے چند ایسے مشہور اہلِ قلم اس کام کا ارادہ کر رہے ہیں جو علماً اور عملاً بدرجہا مجھ ہیچمدان سے افضل و برتر ہیں مگر ایک زمانۂ دراز تک انتظار کرنے کے بعد چند احباب کی خواہش سے میں نے اس فرض میں ہاتھ ڈالا اور ۱۹۰۵ء میں مقدمۂ کتاب کے چند صفحات رسالۂ مخزن لاہور میں شائع کئے۔ اس اشاعت سے دو امر مقصود تھے ایک تو یہ کہ میر مرحوم کے حالات سے جو غیر ملک کے لوگ واقف ہوں وہ میری امداد کریں اور دوسرا امر یہ تھا کہ اگر کوئی صاحب اس کام کو شروع کرنا چاہتے ہوں اور کچھ دقتیں پیش آئیں تو اس کارِ اہم کو مجھ نالائق کے لئے چھوڑ دیں۔ مگر میرے اس مضمون نے سرود بستان یاد دہانیدن کا اثر پیدا کیا اور ان حضرات کو اگر اُس کام میں کچھ غفلت بھی تھی تو گوے سبقت لے جانے کے لئے انہماک پیدا ہو گیا مگر میں بڑے اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہا کیوں کہ مجھے بفضلہٖ تعالیٰ گمانِ واثق تھا کہ میری محنت ٹھکانے لگے گی آخر میری کتاب کے شائع ہونے سے پہلے میر انیس کے متعلق دو کتابیں دو فاضل اہلِ قلم کے ہاتھ سے مرتب ہو کر نکلیں ایک تو علامہ شبلی جیسے مستعد اہلِ قلم کے خیالات کا نتیجہ اور دوسرے جناب اشہری کی فکرِ عالی کا نمونہ۔ چونکہ مجھے کتاب کی اشاعت سے فائدہ اُٹھانا مقصود نہ تھا اس لئے میری تحقیقات و تلاش کو ایک معتدبہ زمانہ گزر گیا اور میں نے اپنی زندگی کے خوشگوار ایام کو میرِ مرحوم کے نذر کر دیا۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم ٭ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

الحمدللہ ان دونوں کتابوں کے شائع ہونے سے میری کتاب کے مقاصد پر ایک مفید اثر پڑا جس کو اہل نظر انشاءاللہ بڑی دلچسپی سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ جناب اشہری اور علامہ شبلی کے تصنیفات کو آپس میں مباینت ہے اور یہ دونوں تصنیفیں جدا جدا اپنی شان دکھاتی ہیں۔ علامہ شبلی نے میر و مرزا کا موازنہ کیا ہے اور وہ موازنہ کیسا ہے اس سے مجھے کچھ بحث نہیں اگر شکایت ہے تو اسی قدر ہے کہ میر انیس کے کلام کا اقتباس بازاری مرثیوں سے کیا گیا ہے جن کی صحت میں صاحبانِ تحقیق کو کلام ہے۔ اگر یہ بات دکھائی جائے کہ علامہ شبلی نے میر صاحب کے مرثیوں میں کہاں کہاں تحریف کی ہے تو طول عمل ہے مگر مصرعے کے مصرعے غلط ہیں۔ اب رہے جناب اشہری وہ اپنی بنیاد خیال میں تحریر فرماتے ہیں کہ نہ بذریعہ خطوط نہ ذاتی طور پر مجھے کسی نے میر انیس کے سوانح سے آگاہ کیا تو پھر شاید آسمانی فرشتوں کی امداد سے کتاب کی ترتیب الہامی طور پر کی گئی ہے اگر ایسا تھا اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ نالائق احسن اس کام میں مدت سے سرمار رہا ہے اور باوجود خصوصیات چند اور ذرائع قوی واقعات صادقہ کے بہم پہنچانے میں تعویق ہو رہی ہے تو بس سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ کام سخت دشوار ہے اور اس خیال سے دست کش ہو جاتے تو کیا اچھا ہوتا کیوں کہ اس ناقص تصنیف سے کوئی فائدہ مرتب نہ ہوا۔ اس کتاب میں سوانح اس قدر غلط ہیں کہ واقعات اصلی سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے میر انیس کا ایک خیالی کیرکٹر اپنے ذہن میں قائم کر کے اس پر طبع آزمائی کی ہے نہ کسی جگہ راویانِ ثقات کا حوالہ ہے نہ کسی مقام پر تحقیقات کی اہمیت پائی جاتی ہے۔ ایک افسانہ کے طور پر من گھڑت میر انیس کے حالات لکھنے میں مبادرت فرمائی ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میر انیس سا ہیرو اس کشمکش میں ڈالا گیا ہے کہ لوگوں کو میر انیس کا کیرکٹر سمجھنے میں مختلف خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جناب اشہری کے صرف بتیس ۳۲ صفحے چھپ کر اس وقت تک کسی ذریعے سے میرے پاس پہنچ گئے ہیں مگر ان بتیس ۳۲ صفحوں میں افسانہ نگاری کی رنگ آمیزیاں اپنی

جھلک دکھا رہی ہیں۔ اب ہم اُس کا انتخاب بھی ناظرین کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں۔

صفحہ ۸ میں میر انیسؔ مرحوم کا شجرہ ہے۔ میر انیسؔ کی اولادِ ذکور میں ایک صاحبزادے کا نام میر جلیسؔ تحریر فرماتے ہیں۔ کس قدر تعجب خیز بات ہے اور کس قدر حیرت انگیز تحقیقات ہے۔ میر ابو محمد صاحب جلیسؔ، میر انیسؔ کے پوتے اور میر محمد صاحب سلیسؔ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی جگہ پر میر محمد عسکری رئیسؔ مرحوم کا نام داخل کرنا چاہیے۔ علاوہ بریں بہت سے اخلاف کا نام شجرے میں چھوڑ دیا گیا ہے تو پھر ایسی صورت میں شجرے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیوں کہ شجرہ ناقص ہے۔ میرے نزدیک ایسی ناتمام چیز لکھنے کی ضرورت نہ تھی اور میں بھی کچھ ضرورت نہیں دیکھتا کہ اُس شجرے کو اپنی کتاب میں صحیح کردوں باوجودیکہ یہ ممکن ہے۔ مگر یہ بات میر انیسؔ کے ذاتی کمال میں کوئی نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔ تاریخی واقعات میں کسی چیز کا چھوڑ دینا یا ناتمام رکھنا بہتر ہے مگر اپنی جانب سے کوئی نئی اُپج اُدھ بنا یہ بات مؤرخ کی شان کے خلاف ہے۔

صفحہ ۸ سے ۱۸ تک میر انیسؔ کے اجداد کے حالات ہیں۔ اُن ورقوں کو میں یک لخت اُلٹے دیتا ہوں۔ اُن حالات کی نسبت میں صحت یا غیرِ صحت سے کچھ بحث نہ کروں گا کیونکہ یہ بات میری کتاب حل کردے گی۔

صفحہ ۱۹ میں فرماتے ہیں کہ میر انیسؔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھنؤ تشریف لائے۔ ان اقوال کو جادۂ تحقیق سے کس قدر مغائرت ہے۔ میر صاحب جب لکھنؤ تشریف لائے تو صاحبِ اولاد تھے۔ میر نفیسؔ مرحوم اور اُن کی دو بہنوں کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی ہے ظاہر ہے کہ جو شخص تین بچوں کا باپ ہو اُس کی عمر پندرہ سولہ برس کی کیوں کر ہو سکتی تھی۔

اسی صفحہ ۱۹ میں فرماتے ہیں کہ شفیق باپ نے انیسؔ تخلص رکھا۔ باوجودیکہ یہ تخلص ناسخؔ مرحوم کا رکھا ہوا ہے اور اس تخلص کی بابت میری کتاب میں پوری نقل لکھی ہوئی

ہے۔ سوانح عمری لکھنے میں اس قدر دلیری اور آزادی بھی قابلِ تعریف ہے۔

صفحہ ۲۷ میں میر انیس کی تہذیب اور تربیت کے لئے لکھنؤ جولانگاہ مقرر فرمایا ہے۔ میر انیس کی شاعری نے لکھنؤ پہنچ کر شہرت حاصل کی۔ اس میں تو کسی کو کلام نہ ہوگا مگر اُن کی تربیت کے لئے لکھنؤ جولانگاہ نہ تھا یہ معمہ اب ہم سے سُنیئے۔ میر انیس کے بزرگوں کا سلسلۂ ملازمت خاندانِ بہو بیگم صاحبہ سے برسوں رہا ہے اور لکھنؤ میں یہی خاندانِ سالار جنگ زبانِ اُردو کا معیار مانا جاتا ہے۔ فیض آباد میں محاورۂ زبان و اصطلاحات و ضرب المثل وغیرہ کا ایک دفتر تھا جس کے میر منشی میر انیس کے جدِّ امجد اور اُن کے بعد والدِ ماجد رہے ہیں۔ یعنی جب کوئی محاورہ اُردو کا محلات سے نیا تراش کر نکالا جاتا تھا تو اُس نصاب میں قلمبند ہوتا تھا کہ جس کے سر دفتری کی خدمت خاندانِ میر انیس کے متعلق تھی۔ اس وجہ سے اُن کی تربیت و تہذیب کا معیار فیض آباد ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ اہلِ لکھنؤ کو اُن کی زبان سے فیض پہنچا ہے۔ ایک اور استدلال بھی قابلِ تحریر ہے۔ یعنی میر انیس مرحوم کو مجمعِ عام میں ہر شخص نے یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ یہ میری اپنی زبان ہے حضراتِ لکھنؤ کیوں نہیں تحریر فرماتے۔ یہ فخر اُن کو اُس دفتر کی بدولت حاصل ہوا تھا۔ اہلِ دہلی میر انیس کے اِس قول سے اُن کی زبان و محاورہ کا انتساب دہلی سے کرتے ہیں مگر یہ فقط دل خوش کُن باتیں ہیں۔ واقفانِ راز اس کو خوب جانتے ہیں۔

صفحہ ۲۵ میں میر انیس کے حُلیہ میں بھی تحقیقِ کامل سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ان مقاصد کو میری کتاب واضح کر دے گی۔ اسی صفحۂ ۲۵ میں فرماتے ہیں میر انیس جس دن سے لکھنؤ تشریف لائے بغیر پینس کے کہیں گھر سے باہر نہیں نکلے۔

گویا ایک طور پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ میر انیس پیدل چلنے سے معذور تھے اور اس بات سے ایک صحیح و تندرست انسان کی صحت و خصائل کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ میر صاحب اکثر تفریحاً پیدل نکلتے تھے اور اپنے مکان سے راقم کے مکان تک اکثر والدِ مرحوم کے ہمراہ تشریف لائے ہیں اور قریب کی مجلسوں میں بھی اکثر پیدل تشریف لاتے تھے۔

صفحہ ۲۶ میں میر انیس مرحوم کی پنجگوشیہ ٹوپی کی بابت یہ فقرہ لکھا ہے۔ "ٹوپی کو خوش سلیقگی سے لگانے میں اُن کو بڑی دلچسپی تھی۔ جب وہ کہیں تشریف لے جاتے تو گولوں پر چڑھی ہوئی آٹھ دس ٹوپیاں حاضر کی جاتیں وہ جس کو پسند فرماتے اُس کو سر پر رکھتے اور آئینہ سامنے رکھ کر اُس کو بار بار درست فرماتے۔ جب تک وہ صحیح موزونیت حاصل نہ کرتے اس شغل سے باز نہ آتے بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ ٹوپیوں کے تبدیل بدل میں صرف ہو جاتا۔"

اس عبارت کی عجب منطق ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ بے حد مبالغہ کیا گیا ہے۔ اول تو گولوں پر ٹوپیاں چڑھی ہوئی ہوتی تھیں، یہ عجب مضمون ہے، پنجگوشیہ ٹوپی قالب پر چڑھائی جاتی ہے اور قالب ہی پر رہتی ہے۔ البتہ بنیے مہاجنوں کی پگڑیاں گولوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ میر انیس مرحوم کی تہذیب اور متانت کا یہ مقتضا نہیں ہے اور نہ وہ ایسے بے کار آدمی تھے جو ایک ایک گھنٹہ ٹوپیوں کے تغیر و تبدل میں صرف کرتے ۔ یہ نقل عجب مضحک ہے اور ایک مجنون آدمی کا کیرکٹر دکھایا گیا ہے اور اس خود آرائی میں مبالغہ شاعرانہ صرف کیا گیا ہے۔ واللہ کہ میر انیس کو عجیب المخلوقات ثابت کرنے میں جناب اشہری کا قلم نہایت آزاد ہے۔

اسی صفحہ ۲۶ میں فرماتے ہیں کہ "کبھی گول پردے کا انگرکھا زیب جسم فرماتے تھے۔" ہرگز نہیں۔ میر انیس کے لباس کے متعلق راقم آثم نے محقق طور پر لکھ دیا ہے جو آئندہ اوراق میں ملاحظہ سے گزرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ علم کی جنتری کی تصویر سے جناب اشہری نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔

صفحہ ۲۷ میں فرماتے ہیں کہ "میر خلیق خاص خاص مجلسوں میں میر انیس کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ یہ قریب منبر کے بیٹھتے اور ختم مجلس تک اُسی شان سے بیٹھے رہتے۔ زانو بدلنا کیسا کوئی عضو بھی حرکت نہ کرتا۔"

مولوی صاحب کے نزدیک میر مرحوم کا یہی انداز ہر دلعزیزی اور وقار کا باعث ہے
لیکن دراصل اس انداز میں بے حد خشونت پائی جاتی ہے اور ایک غبی شخص کا کیرکٹر دکھایا گیا
ہے۔ گویا میر انیس جذباتِ شاعری سے متاثر نہ ہوتے تھے اور ایک پتھر کے اسٹیچو کی طرح
مجلس میں بیٹھتے تھے کہ زانو بدلنا کیسا پلک بھی نہ جھپکنے پاتی تھی۔ یہ پوزیشن بالکل شاعرانہ
بے چینیوں کے خلاف ہے اور ایک خشک مزاج جاہل کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اِن بتیس[۳۲]
صفحوں پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہم اپنی کتاب کے مقاصد کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔
آخر یہ خیال پیدا ہوا کہ وقت غنیمت ہے اور وسائل قوی۔ کیا خبر تھی کہ یہ متبرک فرض مجھ
ہیچمدان سے متعلق ہوگا ورنہ ایک زمانے میں ایسا موقع حاصل تھا کہ اگر میں چاہتا تو ایک
کافی مواد اپنی اس تصنیف کے متعلق جمع کر لیتا کیوں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے بائیس سال
کی عمر تک میں نے کتبِ درسیہ عربیہ کا اکتساب جنابِ نفیس اعلی اللہ مقامہٗ سے کیا ہے
اور دس بارہ سال کی حاضر باشی کچھ کم نہیں ہوتی مگر اللہ اللہ وہ وقت ہی اور تھا اور عالم
ہی نرالا تھا۔ ایامِ شباب کی بے چینیاں کسی پہلو قرار نہیں لینے دیتی تھیں۔ ایک دل تھا
اور ہزاروں تمنائیں۔ ایک سر تھا اور ہزاروں سودے۔ کبھی دلفریب حُسن کی تعریف میں
رطب اللسانی اور کبھی جذباتِ عشق کے اظہار میں شیریں زبانی۔ وقت کا تیز پرواز پرندہ
معمولی سُرعت کے ساتھ ہر روز مشرق سے مغرب کی جانب چلا جاتا تھا اور یہاں عالمِ بیخودی
کے مسافر کو ہوش بھی نہ آتا تھا ؎

عمر بھر ہم نے کیا کیا ہے گناہوں کے سوا
آہ کیا عذرِ گنہ کیجیے آہوں کے سوا

الحمد للہ علیٰ احسانہٖ اُستادِ مرحوم کی صحبت میں سُنی سنائی باتوں کا ذخیرہ اب بھی میرے
دماغ میں محفوظ ہے جس سے عندالضرورت کام لوں گا۔ مزید برآں فقیر احسن کے بزرگوں کو
اس خاندانِ بزرگ سے قدیمانہ ارادت ہے اور میرے زمانے میں رشتۂ مصاہرت کے
رسمِ جدید نے اُن خصوصیتوں میں اور بھی ایک کافی اضافہ کر دیا لہٰذا حقوقِ ذاتی پر نظر کر کے

اخی المعظم جناب عارف مدظلہٗ اور مخدوم و مکرم جناب پیارے صاحب قبلہ رشید کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان صاحبوں نے امداد فرمائی۔ اس کے علاوہ بھی میں نے دُنیا کی خاک چھان کر اِس تحقیقات میں جو وسعت پیدا کی ہے انشاء اللہ وہ حیرت انگیز نظروں سے دیکھی جائے گی۔ واقعی یہ میرے سوا اَوروں کا کام نہ تھا اور نہ اُن کے وسائل اس قدر قوی تھے۔ اب یہ بات ظاہر کر دینے کے قابل ہے کہ سوانح عمری قلمبند کرنے میں مہتم بالشان واقعات کا بیان مقصود ہوتا ہے اور معمولی حالاتِ زندگی علیٰ سبیلِ تذکرہ لکھ دیئے جاتے ہیں کیوں کہ معمولی حالات پر زور دینے سے لائف دلچسپ نہیں بنائی جا سکتی اور ایسے ہیرو کی لائف مدوّن کرنے میں مؤلف کو زیادہ کامیابی ہوتی ہے کہ جس کی ابتدائی زندگی سے فسانہ خیز واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو۔ دیکھو نپولین بونا پارٹس لائف۔ جب اس فرانس کے مشہور فاتح بادشاہ کا دبدبۂ شاہی پردۂ عدم میں تھا اور اُس کی شہرت کے معشوقِ دلفریب کے عارضِ روشن پر نقاب پڑی ہوئی تھی جب ہی سے حُسنِ شہرت اندر ہی اندر اپنی جھلکیاں دکھانے لگا۔ ہم اُس کی ابتدائی عمر کا ایک دلچسپ واقعہ یہاں پر بیان کرنے کے قابل سمجھتے ہیں اور ایسی نقلیں اس کی بایوگرافی میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ آٹھ سال کی عمر میں وہ اپنے مدرسہ کے ہم جماعت لڑکوں کے دو گروہ بناتا تھا اور آپس میں ایک دوسرے کے مخالف بن کر جنگ شروع کرتے تھے۔ ایک روز وہ بازیچہ اطفال کے مصنوعی اور فرضی قلعہ پر دھاوا کر رہا تھا اور خود ایک گروہ کا کمانڈر تھا۔ اس کے ایک ماتحت لڑکے نے تعمیلِ حکم میں غفلت کی۔ نپولین نے ایک گھونسہ مارا لڑکے کا رخسار پھٹ گیا۔ باوجود اس خطرناک حالت کے لونا پارٹ نے کچھ پروا نہ کی اور اپنے فرض میں اُس وقت تک منہمک رہا جب تک قلعہ کی فصیل پر قبضہ نہ کر لیا۔ اسکول کے پروفیسر نے جواب طلب کیا۔ نپولین نے کہا کہ میں مجبور تھا مجھے جذباتِ جنگ نے دیوانہ بنا دیا تھا اور مَیں اپنے آپ کو اُس وقت ایک اصلی کمانڈر سمجھتا تھا مگر اب اُس جرم کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔

میری غرض یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کے سنگین اور محتشم واقعات زیادہ قابلِ قدر ولائقِ تحریر ہوتے ہیں اور ایسی شہرتوں سے سوانح عمری کے اوراق مطلا اور مذہب کئے جاتے ہیں۔ شہرت اور نام آوری کے دلِ خوش کُن خواب میر انیسؔ نے کبھی نہیں دیکھے۔ شہرت خود اُن کے پاس آئی اور اُن کا ہر دلعزیز تخلص دُنیا میں مقبول کرا دیا۔ نہ وہ خود شہرت کے قریب گئے اور نہ اُس کے طالب ہوئے۔ شہرت کے رائج الوقت وسائل سے اُنہوں نے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ نہ پولٹیکل انجمنوں کے رکن تھے نہ سفارتِ قوم کی غرض سے لندن کی اعلیٰ سوسائٹیوں میں شریک ہوئے، نہ نیشنل کانفرنس کے عظیم الشان جلسوں میں تقریریں کیں نہ اپنی معلوماتِ علمی اور اعزازِ خاندانی کو اخباری کالموں میں شائع کرایا۔ نہ خان بہادر نہ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی ہوئے بس اُن کی شہرت موجباتِ صفاتی کے سبب سے نہیں ہے بلکہ اُن کی صفاتی خوبیاں محاسنِ ذاتی کا پرتو ہیں۔ یہ ایک بحث طلب مضمون ہے۔ مگر میری تحریر کا مقصود صرف اتنا ہے کہ دولت مندی سے اقبال اور اقبال سے جو احترام دنیا میں حاصل ہوتا ہے وہ دولت و اقبال چلے جانے کے بعد انسان کو مرکزِ اصلی کی جانب واپس کر دیتا ہے مگر جو احترام و اقتدار ہنر و کمال کے ذریعے سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ غیر فانی ہے۔ دولت و اقبال کا حاصل ہونا اتفاقاتِ زمانہ پر مبنی ہے۔ خواہ اہلِ کمال ہو یا نہ ہو۔ چونکہ دُنیا میر انیسؔ کو کسی خطاب سے نہیں پہچانتی اس لئے ہمارے ہیرو کی تاریخ بہت دھندلی ہے۔ کمال کے آئینہ میں فقط شاہدِ کمال کی جھلک دکھائی دیتی ہے، مگر پچھتر سال کے گرم وسرد کا پتہ نہیں چلتا۔ فقط ایسے لوگوں کی معلومات سے میں نے اپنی تصنیف کی شیرازہ بندی کی ہے جن کے دماغوں کا گرامو فون اُس عہد کے سُریلے ترانوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہی آج اُن آوازوں کو باہر پھینک رہے ہیں۔ سَو برس کا نظامِ تاریخی مرتب کرنے میں جو دقتیں پیش آئی ہیں اُن کو وہی لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے کبھی ایسی پیچیدہ زندگی کے حالات لکھنے کو قلم اُٹھایا ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی خاص انتظام نہ کیا جائے تو ہر شخص خود اپنی

زندگی کے تمام وکمال حالات بتانے سے مجبور رہے۔ پھر دوسروں کی کتابِ زندگی کا شیرازہ
باندھنا تو ایک دشوار امر ہے۔ ہر ابتدائی زندگی جس کی شہرت پردۂ عدم میں پنہاں ہو
معراجِ کمال پر پہنچ کر پیچھے پلٹنے کا راستہ نہیں بناتی اور نہ اس ترقیِ معکوس کا پہلے سے
لحاظ رکھا جاتا ہے۔ سوانح عمری وہی شخص خوب لکھ سکتا ہے جو اپنی زندگی کو ہیرو کی زندگی
سے وابستہ کرلے اور صحیفۂ عمر کے ابتدائی باب سے قابل الذکر مسائل نوٹ کرتا جائے۔

دیکھو نلسن کی سوانح عمری مصنفۂ رابرٹ سوتھی یا ڈاکٹر جانسن کی لائف مصنفہ
باسولِ۔ ناولز یا افسانوں کو انشا پردازی کی رنگ آمیزیاں دلفریب بنا سکتی ہیں مگر واقعاتِ
اصلی کی سادی تصویر میں قابل مصنف کا زوردار قلم کوئی رنگ نہیں بھر سکتا اور نہ ایمانداری
اجازت دیتی ہے کہ کسی قسم کا تغیر و تبدل کیا جائے۔ نہالِ زندگی اور اُس کا نشوونما جن
حوادث سے وابستہ ہے اُس کی ایک شاخ میں جس قدر پھول اور کانٹے ہیں گلدستہ بنانے
کے وقت دونوں کام میں لائے جاسکتے ہیں۔ یہ دقتیں عام ہیں اور میرے لئے خاص دقتیں
بھی سنگِ راہ ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سیدِ مرحوم کی وفات سے زمانہ صرف بتیس
برس آگے بڑھا ہے مگر واقعات اس قدر تاریکی میں ہیں کہ کوئی روشنی راہنمائی نہیں کرتی کتابِ
عالم کے صرف بتیس ورق اُلٹنے پر پچھلے ورقوں میں کوئی نشانی رکھی ہوئی ایسی نہیں پائی جاتی کہ جس
سے ہم دیباچۂ کتاب کے مطالب کی جانب عود کریں۔ تذکرۂ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن
کو شائع ہوئے تیس برس کا زمانہ گزرتا ہے اور وہ زمانہ میر انیس کی وفات سے بہت قریب
تھا۔ سلطنتوں کا عروج و زوال دیکھنے والی ہزاروں آنکھیں کھلی تھیں اُس وقت بھی جب اس
تحقیقات کے آفتاب کی نورانی شعاعوں پر غفلت و بے پروائی کی بدلیاں چھائی رہیں تو کم نصیب
احسن کیونکر اس دشوار گزار منزل کو طے کرسکتا تھا۔ لکھنؤ میں ایسے کہن سال حضرات اب بھی
موجود ہیں جن سے وثوق کے ساتھ میر صاحب کے حالات دریافت کرنے کی اُمید کی جاتی
تھی مگر وہ لوگ اِس معاملے میں ایسے خاموش نکلے کہ گویا وہ اس دولت کے خزانے کو اپنے

ساتھ قبر میں لے جانے کے لئے دُنیا میں جی رہے ہیں۔ اتنی مجبوریوں پر بھی میں نے اپنی کتاب کو ہر دلعزیز اور معتبر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ واقعات کی تحقیقات ثقات راویوں سے کی ہے اور حتی الامکان اُن کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ مسودہ تیار کر کے اخی المعظم جناب عارف اور مخدوم و مکرم جناب پیارے صاحب قبلہ کے سامنے پڑھ کر تصحیح و ترمیم بھی کر لی ہے۔ اُفوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد۔

میر انیس کا سلسلۂ خاندانی

میر انیس کا سلسلۂ خاندانی بیان کرنے کے لئے ہم اُن کے جدِ امجد میر حسن مرحوم کے کُلّیاتِ قلمی سے ایک عبارت نقل کئے دیتے ہیں جو خود میر حسن مرحوم نے اپنا سلسلۂ خاندانی بتانے کے لئے مقدمۂ دیوان میں تحریر فرمائی ہے اور اس سے زیادہ معتبر کوئی چیز نہیں دیکھتے۔ یہ قلمی دیوان اس وقت میر انیس کے خاندان میں موجود ہے۔

اما بعد بر سخنورانِ شاطر و دانشورانِ ماہر مخفی نماند کہ اصلِ این مؤلف ابنِ میر غلام حسین ابنِ میر عزیز اللہ ابنِ میر برات اللہ ابنِ میر امامی موسوی از شاہجہان آباد است کہ میر امامی موسوی در وقتِ شاہجہان بادشاہ از ہرات آمدہ بہ منصبِ سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردیدند۔

فاضلِ متبحر و فقیہِ بے مثیل بودند گاہ گاہ بجہتِ تفریحِ طبع فکرِ شعر ہم می نمودند کہ انکارِ معاد فرصتِ بے فائدہ گوئی نمی بخشد پس این عاجز سخن را سر رشتۂ شاعری اجدادیست بزامروزی و قبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالیٰ باانیہمہ قدرتِ علم چون طبایعِ سامعان را در خورِ سخنِ بلند نیافتند بقدرِ حوصلہ آنہا بطرفِ ہزل توسنِ قلم راندند بحکمِ آنکہ۔ مصرعہ: زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز۔ چون این ابجد خوانِ دبستانِ سخن در سنِ صغر کہ ہنوز ایام سبا منقضی نشدہ بود بیتے گفتہ بود

و آن این است ؎

یک سخن گویم ترا بشنوز من اے یارِ من　　گر نخواہی رنجِ خود اے جان مدہ آزارِ من

بر صاحب سخنان ثابت گردید کہ این طفل البتہ موزونست و ازین کلامے مقبول تر خواہد زد۔ حاصل کہ السعید من سعید فی بطن امہ والشقی من شقی فی بطن امہ ہر کرا حق سبحانہٗ تعالیٰ بہر کارے آفریند از صغر سن میلانِ طبیعتِ او بسوے اکتساب میکشد و این امور کسبی نیست بلکہ موہبی است لہٰذا عارفانِ ربانی زبان بطعنِ کسے نکشایند کہ نظرِ اوشان بر فاعلِ حقیقی ست و شکایتِ او تعالیٰ نمودن شرکِ عظیم عیاذاً باللہ۔ غرض چون از گردشِ روزگار بہ لکھنؤ رسیدم رُباعی گفتم بزبانِ فارسی کہ شیخ صاحب[1] نور اللہ مرقدہٗ از زبانِ قبلہ گاہی ابد اللہ عاطفہ شنیدہ بحقِ این عاصی دعاے فرمودند و شاید این نتیجۂ دعاے آن بزرگِ عالی قدر باشد کہ توفیقِ سخن یافتم و الامن کجا و این گفتگو ہا۔ رُباعی اینست ؎

جاناں ز تو اُمیدِ نگاہے داریم　　اُمیدِ نگاہے ز تو گاہے داریم
با گُشتۂ چشم سرمہ سایت ہستیم　　نے نالہ و نے فغان نہ آہے داریم

و شعرے نیز با این بود ؎

اے شمع مپرس سرگذشتم　　خاموش کہ من ز سر گذشتم

چوں در فیض آباد خرب اللہ تعالیٰ عن الآفات رسیدم بخدمتِ میر حبیب اللہ برادر زادۂ

---

[1] شیخ صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے خدا جانے کیا مراد ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید شیخ علی حزیں مرحوم سے مراد ہو کیوں کہ میر حسن کا زمانہ زمانۂ آصف الدولہ میں ہے اور وہی زمانہ شیخ علی حزیں کے قیام بنارس کا ہے اگر شیخ ناسخ سے مراد لی جائے تو وہ اُس وقت زندہ تھے مگر اُن کے کمال کی شہرت ایسی نہ تھی کہ جن کی تعریف میر حسن کے لئے فرمانِ آل تمغا ہوتی۔ البتہ مرزا قتیل کے ایک رقعہ سے زمانۂ سعادت علی خان میں شیخ ناسخ کا وجود پایا جاتا ہے اور سعادت علی خان کا زمانہ آصف الدولہ سے بہت قریب ہے۔

شاہ سجن قدس اللہ سرہٗ کہ درویشِ معروف اند و میر ابراہیم نوّر اللہ مضجعہٗ برادرِ ایشان نیز مشہور صحبت گزیدم زادہائے طبعِ خود را می نمودم اگرچہ سیّدِ مسطور طبعِ موزون ندارند لاکن سلمہ اللہ تعالیٰ در فہمیدن ممتازِ سنجیدگان اند و بزرگان فہمیدنِ شعر را بہ از گفتن جائز داشتہ اند کسے گفتہ۔

شعر گفتن گرچہ دُر سُفتن بود　　لیک فہمیدن بہ از گفتن بود

روزے بفرمائشِ آن شفیق ریختہ انشا کردم کہ از فصاحتِ زبان دانانِ ہند فصیح آمد از آن باز چون زبانِ خود گُفت از فارسی گذشتہ انچہ بدل آمد گفتم لیکن اصلاحِ حروف و معانی بخدمتِ میر صاحب ضیائے بزمِ سخن دانانِ آتش زن کانونِ سوختہ و روشان میر ضیاء الدین حسین دام افضالہٗ کہ ضیا تخلص دارند گرفتم لیکن طرزِ سخنِ ایشان کماہی از من سرانجام نشد بقدمِ دیگر بزرگان مثلِ حضرات خواجہ میر درد صاحب کہ دردمندی ہائے او شان عالمگیر ست و از کلامِ درد او شان جگرِ عالمی پُر درد و ذاتِ با برکاتِ او شان میانِ درویشان چون فرد فرد۔ سوم صاحبِ رفعت رفیع المنزلت مرزا رفیع صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کہ از رائے صائب زیادہ ناطق اند نظیرِ نظیری و جانِ قدسی اشعارِ او شان ست۔ چہارم میر محمد تقی ہمشیر زادۂ شیخ سراج الدین خان آرزو کہ سراجِ محفلِ شعرا بود و از صرصرِ زمانہ خاموش گردیدہ نوّر اللہ مرقدہٗ کہ تخلص میر دارند و بابا فغانی را در نالۂ خود زیر میخوانند و دمِ فطرتِ او شان طنطنہ در جہان افگندہ و دیگرے بخیالِ خود قائم نہ کردم کہ وضعِ آن را پسندم و دل بگفتارِ آنہا بندم۔

میر انیسؒ کا مقامِ پیدائش

میر ببر علی مرحوم ۱۲۱۶ھ ہجری میں محلہ گلاب باڑی شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ امامی موسوی ہرات سے آئے اور پُرانی دلّی میں آباد ہوئے۔ میر حسن کی پیدائش بھی دلّی ہی میں ہوئی ہے۔ صاحبِ تذکرۂ گلزارِ ابراہیمی لکھتے ہیں کہ میر حسن دلّی میں بعہد

مسجد کے پاس رہتے تھے اور حکیم قدرت اللہ خان قاسم تحریر فرماتے ہیں کہ میر حسن کی ولادت محلّہ سید واڑہ میں ہوئی جو پرانی دہلی کا ایک محلہ تھا۔ بہر کیف دونوں تذکروں کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ جب ہوائے تنزّل کے جھونکے دلّی کے گلزارِ سلطنت کو پامال کر رہے تھے اس وقت انقلاب کے سمندر کی طوفانی موجوں نے اہلِ کمال کو مختلف راستوں پر بہا دیا تھا۔ صاحبانِ جوہر کے لئے دو مقام امیدگاہ سمجھے جاتے تھے ایک لکھنؤ اور دوسرا حیدر آباد دکن۔ حیدر آباد میں دیوان چندو لال کے دستِ فیاض نے آرزومندوں کے دامن بھر دیے اور لکھنؤ میں آصف الدولہ کی سخاوت نے حاتم کا نام زندہ کر دیا۔ لکھنؤ دار السلطنت مقرر ہونے سے پیشتر میر حسن کا خاندان دہلی چھوڑ کر فیض آباد میں سکونت پذیر ہوا۔ مختلف تذکروں سے ثابت ہوتا ہے۔ بہر کیف زمانۂ آخر میں فیض آباد اور لکھنؤ دونوں شہروں کو میر انیس مرحوم کے حالات سے تعلق ہے۔ آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو مستقل دار الریاست قرار دیا تو میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت تعلقاتِ شاہی کی وجہ سے لکھنؤ میں جاری ہوئی۔ مگر مستقر فیض آباد ہی کو سمجھنا چاہیئے۔

یوں تو سعادت علی خان کے زمانے کے معرکوں سے ثابت ہوتا ہے کہ میر ضاحک مرحوم جرأت، انشاء، مصحفی وغیرہ کے دور میں لکھنؤ میں موجود تھے اور میاں گدا کے مناظرہ کا طوفان بھی اسی وقت کا ایک قصہ ہے۔ آصف الدولہ کے عہد میں جب میر حسن مثنوی بدرِ منیر کی تصنیف میں مصروف تھے اس وقت میر خلیق کے آمدِ سخن سے گھبرا کر اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے ہونہار فرزند کی اصلاحِ کلام شیخ مصحفی سے متعلق کر دی تھی۔ چنانچہ شیخ صاحب نے اپنے تذکرے میں بھی ان کی شاگردی کا حال بڑے فخر و مباہات سے بیان کیا ہے اور اس وقت میر خلیق کی عمر انیس ۱۹ سال کی لکھی ہے۔ صاحب تذکرۂ گلزارِ ابراہیمی تحریر فرماتے ہیں کہ میرے تذکرے کے لئے جو میر صاحب نے اپنا کلام لکھنؤ سے روانہ کیا ہے اس کے ساتھ ایک تحریر بھی ہے جو بعینہٖ درج تذکرہ کی جاتی ہے۔

از سائر ابیات مدونۂ من ہشت ہزار بیت ست تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ د اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام مدتی ست کہ از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ با نواب سالار جنگ و خلف ایشان ملقب بہ نوازش علی خان سرفراز جنگ بہادر میگذاریم

مگر میر صاحب نے "از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ" سے خدا جانے کیا مراد لی ہے باوجودیکہ میر صاحب دہلی سے براہ راست فیض آباد تشریف لائے ہیں اس جملہ سے فیض آباد کا تعلق بالکل جاتا رہتا ہے مگر دراصل بات یہ ہے کہ لکھنؤ حاکم نشین شہر ہونے کی وجہ سے اس وقت فیض آباد توابع لکھنؤ میں داخل تھا لہٰذا اس تفصیل کو ضروری نہ سمجھے۔ میر حسن مرحوم نے یکم ماہ محرم ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور مفتی گنج میں نواب قاسم علی خان کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے۔ شیخ مصحفی کی تاریخ سے سنہ وفات معلوم ہوتا ہے۔

چون حسن آن بلبل خوش داستان — رو ازین گلزار رنگ و بو بتافت

بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی — شاعر شیریں زبان تاریخ یافت

زمانۂ امجد علی شاہ میں جب میر خلیق نے فیض آباد چھوڑ کر مستقل لکھنؤ کی سکونت اختیار کی تو میر انیس بھی صاحب اولاد ہو چکے تھے۔ میرے استاد مغفور جناب نفیس اور ان کی دو بہنوں کی پیدائش بھی فیض آباد ہی میں ہوئی ہے صرف ایک صاحبزادی میر انیس مرحوم کی لکھنؤ میں پیدا ہوئیں مگر پھر وہ فیض آباد ہی میں منسوب ہوئیں۔

میر انیس کے سنہ ولادت کی تحقیق میر علی حسن صاحب اشک سے ہوئی ہے۔ یہ بزرگ حیدر آباد میں ایک خوش گو شاعر مانے جاتے تھے۔ ایام غدر سے پیشتر دکن تشریف لے گئے اور سرکار نظام خلد اللہ ملکہ سے کچھ منصب بھی پاتے تھے۔ پرانے طرز کے وضع داروں میں تھے اہل تذکرہ نے ان کا سلسلۂ خاندانی حسن الاصغر بن حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے لکھا ہے۔ میر عماد خوش نویس کے اخلاف میں تھے۔ راقم آثم کو جب دفتر رکاب سعادت اعلیٰ حضرت نظام دکن کی باریابی کا فخر حاصل تھا اس وقت میر صاحب مرحوم اکثر غریب خانے

پر تشریف لاتے تھے اور مشاہیرِ لکھنؤ کا ذکر فرماتے تھے۔ اُن کے والد حبیبؔ تخلص کرتے تھے اور میر انیسؔ مرحوم کے بچپن کے دوست تھے اور فیض آباد میں ایک ہی محلہ میں دونوں صاحبوں کی سکونت تھی۔ ایک روز میر اشکؔ نے میر انیسؔ مرحوم کی تاریخِ ولادت کے متعلق ایک مصرعہ پڑھا جس سے ۱۲۱۶ھ برآمد ہوتے تھے اور یہ بھی بیان فرمایا کہ یہ مصرعہ میں نے اپنے والد کی زبان سے سُنا تھا۔ یہ ایک بیس برس کی بات ہے اُس وقت مجھے خیال نہ تھا کہ یہ اذکار کچھ بکار آمد ہوں گے ورنہ اُس مصرعہ کو لکھ لیتا۔ اور زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میر اشکؔ مرحوم نے میری حیدر آباد دکن کی موجودگی میں ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا ورنہ وہ اس خاندانِ بزرگ کی زندہ تاریخ تھے۔ میری اکثر مشکلیں اُن سے آسان ہو جاتیں۔

اخی المعظم جنابِ عارفؔ سلمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میر انیسؔ مرحوم نے بہتر[1] سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور میرے والدِ مرحوم فرماتے تھے کہ ایک روز جنابِ نفیسؔ نے اپنے ضعف و ناتوانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میر حسن علی میری عمر اسّی سال کی ہے۔ میں اپنے والد سے عمر میں پانچ سال زیادہ ہوں اس لئے اب میرا کیا اعتبار، چراغِ سحری سمجھو۔ کیونکہ ہر خاندان میں عمروں کو ایک گونہ مطابقت ہوتی ہے اس اعتبار سے میر انیسؔ کی عمر پچھتر سال کی قرار پاتی ہے۔ ۱۲۹۱ھ میر انیسؔ کا سالِ فوت ہے اور اسی سنہ سے زمانۂ ماضی کی جانب عود کرو تو ۱۲۱۶ھ تک پہنچ کر پچھتر سال کا زمانہ پورا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ توجیہہ قابلِ اطمینان ہے اور میر مرحوم کا سنہِ ولادت یقینی ۱۲۱۶ھ ہونا چاہیے۔

نصیر الدین حیدر کے زمانۂ سلطنت تک میر انیسؔ کی شہرت لکھنؤ میں نہیں پائی جاتی کیونکہ مرزا رجب علی بیگ کے فسانۂ عجائب کی ابتدا زمانۂ غازی الدین حیدر میں ہوئی اور عہدِ نصیر الدین حیدر میں وہ تمام ہوا۔ سرورؔ نے اس کتاب میں لکھنؤ اور صاحب کمالانِ لکھنؤ کا ذکر کیا ہے۔ اُس وقت کے اندازِ انشا پردازی کے موافق تلمیحاً علماء و کملا سے لے کر ادنےٰ طبقے کے لوگوں تک کا ذکر کر گئے ہیں مگر اس فہرست میں میر انیسؔ کا نام نہیں پایا جاتا۔

[1] (دیکھو صفحہ آئندہ)

لکھنؤ کے اکثر کہن سال بزرگوں سے بھی یہی دریافت ہوا کہ زمانۂ امجد علی شاہ میں میر انیسؔ کا مستقل قیام لکھنؤ میں ہوا ہے۔ جب یہ خانوادۂ سیادت یک لخت ترکِ وطن کرکے لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوا تو اُن کا مکان محلّۂ شہتی گنج یا شیدیوں کے احاطہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک اختلاف واقع ہے۔ اکثر حضرات فرماتے ہیں کہ وہ پہلا مکان جس میں میر انیسؔ

---

[1] (از صفحہ گزشتہ) مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاف باطن نیک ضمیر خلیق، فصیح، مردِ مسکین بکمروہاتِ زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا اللہ کے کرم سے ناظمِ خوب دبیرِ مرغوب سکندر طالع بصورتِ گدا بارِ احسانِ اہلِ دوَل کا نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ اور سلام کا دیوانِ کثیر فرمایا۔ (دیکھو فسانۂ عجائب صفحہ ۸ مطبوعہ مطبع نولکشور)

[2] ایامِ غدر سے پیشتر آصف الدولہ کے امام باڑہ کے قُرب و جوار میں ایسے بہت سے محلّوں کا پتہ چلتا ہے جن میں شرفاء اور امرائے شہر کے مکانات ہیں بلکہ دربارِ شاہِ اودھ کے اکثر اراکین بھی وہیں رہتے تھے۔ شہتی، شیدیوں کا حاطہ، چاندی بازار، خاص بازار، ٹوٹی محلہ، شخین دروازہ، لال مسجد، مچھی بھون۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد جب فاتح قوم نے شہر کی اسٹائل بدلی تو لکھنؤ کے جغرافیہ میں بہت کچھ ترمیم ہو گئی آصف الدولہ کا امام باڑہ قلعہ کے کام میں لایا گیا اور وہ عالی شان عمارتیں کھدوا ڈالی گئیں، خانہ ویرانوں کے مسکن مسمار ہو گئے۔ بہت حصہ اراضی کا قلعہ کی خندق بنانے کے کام میں لایا گیا اور باقی ماندہ ایک بیہڑ میدان کی حیثیت سے مدت تک پڑا رہا۔ پُرانے لوگوں کو اُس کھنڈر سے بھی محبت تھی۔ وہ اپنے بزرگوں کے جاہ و جلال یاد کرکے کسی پرانے درخت کے نیچے بیٹھ کر دو آنسو بہا لیتے تھے۔ چونکہ ویرانہ قدرتی طور پر واقعاتِ تاریخی کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے اس خاک سے پیدا ہونے والوں پر اُس خرابہ کا اثر زیادہ پڑتا تھا خصوصاً وہ لوگ جن کی آنکھوں نے سلطنت کا دور دیکھا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ بارہ برس کے بعد گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں اس لئے اس زمین پر بھی آسمان کو رحم آگیا اور گورنمنٹ برطانیہ کے معزز حکام نے اُس کے ایک عظیم الشان حصے میں وکٹوریہ پارک کی یادگار قائم کی اور اُس کے مصارف کو حسین آباد مبارک کے فنڈ سے متعلق کر دیا۔ دریائے گومتی سے گول دروازے تک عرض و طول میں قریب مربع واقع ہے اور اب تک متعلقہ (دیکھو صفحہ آئندہ)

نے سکونت اختیار کی دیانت الدولہ نے میر صاحب کے نذر کیا تھا دیانت الدولہ کو میر صاحب سے کمال عقیدت تھی۔ ایک امام باڑہ ایک محل سرا محلہ سبھٹی میں تعمیر کرایا۔ امام باڑے میں میر صاحب کو پڑھوایا اور مکان نذر کیا مگر جناب میر علی محمد صاحب عارف اور میر سید علی صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے پیشتر بھی میر صاحب کا ذاتی مکان اس محلہ میں موجود تھا۔ بہر کیف اِن دونوں صورتوں میں اسی محلہ کو میر مرحوم کی سکونت کا فخر حاصل ہے گو اب مکان و مکین دونوں کا نشان تک باقی نہیں۔ میر انیس مرحوم خود فرماتے تھے کہ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اُس وقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے۔ ایک تو میر مداری صاحب جو پار میں رہتے تھے اور دوسرے مرزا سلامت علی دبیر مرحوم۔ میر مداری کے جاننے والے تو لکھنؤ میں بہت کم نکلیں گے مگر مرزا صاحب کی شہرت راقم آثم کی تعریف سے بے نیاز ہے۔

میر انیس جب لکھنؤ میں تشریف لائے تو اُن کا تخلص حزیں تھا۔ شیخ حُسین بخش صاحب سے دریافت ہوا کہ ایک روز میر انیس اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ شیخ ناسخ کی خدمت میں حاضر تھے اور صحبتِ شعر و شاعری گرم تھی۔ شیخ صاحب نے میر انیس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میاں صاحبزادے کچھ اپنا کلام پڑھو۔ میر صاحب نے اپنے والد کے اصرار سے یہ مطلع پڑھا ؎

کھُلا باعث یہ اُس بے درد کے آنسو نکلنے کا ۔۔۔ دھُواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

(بقیہ صفحہ گذشتہ) افتادہ اراضی سے اُس کی رونق و وسعت کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ شام کے قریب ایک دلکشا منظر ہے۔ خوشنما بنچوں پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مجمع نظر آتا ہے مگر عبرت کا سبق حاصل کرنے والوں کا دل اب وہاں نہیں بہلتا کیوں کہ وہ اصلی نظارہ باقی نہیں ؎

ہر کجا خشتِ کہن بینی تو در ویرانہ ۔۔۔ ہست فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانہ

شیخ صاحب جھومنے لگے اور میر خلیق سے فرمایا کہ یہ فرزند رشید آپ کے یادگار خاندان ہوں گے اور یاد رکھئے ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان کی زبان اور ان کی شاعری کی عالمگیر شہرت ہو گی کیوں کہ عنفوانِ شباب میں ان کی ترقی پسند طبیعت اپنی بے چینیاں دکھا رہی ہے مگر بجائے حزیں ان کا تخلص کچھ اور ہو تو بہتر ہے۔ میر خلیق مرحوم نے فرمایا کہ پھر آپ ہی ان کے لئے کوئی تخلص تجویز فرمایئے۔ شیخ صاحب نے تھوڑا سکوت کیا اور پھر فرمایا کہ مجھے تو انیس پیارا معلوم ہوتا ہے۔ میر انیس نے بکمالِ ادب سلام کیا اور اُس روز سے انیس ہو گئے۔ کیا مبارک زمانہ تھا کہ جب یہ سر دلعزیز تخلص ایک عالی نسب سیّد زادہ کے نام سے مِل کر ایسا چمکا کہ آج اُس کی روشنی مُلک کے ہر گوشے میں ضیا باری کر رہی ہے اور اُس قیافہ شناس مشاق بڈھے کی پیشین گوئی سچی ہو گئی۔

مخدوم و مکرم جناب پیارے صاحب قبلہ رشید فرماتے ہیں کہ آشوبِ غدر کے بعد میر صاحب نے چند روز محلہ منصور نگر میں بھی قیام کیا ہے وہاں سے راجہ کی بازار تشریف لے گئے پھر چوبداری محلہ یعنی سبزی منڈی کے مکان میں تشریف لائے اور اس مکان کو بطورِ خود تیار کرایا۔ اس کے متعلق اور چند قطعہ مکانات میر صاحب کی مِلک ہیں جن پر ورثائے شرعی کا قبضہ ہے۔ مکانِ سکونت کے قریب ایک چھوٹا سا باغ بھی تھا اب اُس میں میر صاحب مرحوم کی قبر ہے بلکہ اور خاندانی لوگوں کے مدفن بھی اُسی باغ میں ہیں۔ باغ کسی وقت شائد ہو جب اُس کا نام باغ رکھا گیا تھا مگر اب تو اُس زمین سے سبزہ بھی بیگانہ ہے البتہ خاندانِ سیادت کے مقدس مزاروں کا چمن کھلا ہوا ہے جس پر رحمت کے فرشتے اپنے پروں کا سایہ کئے ہیں اس ارضِ مقدس کے ایک گوشہ میں کم نصیب احسن کی گلزارِ زندگی کا ایک غنچہ نو دمیدہ بھی موت کے بادِ سموم سے مُرجھا کر خاک میں مِل گیا ہے۔

جس وقت سے کہ میر انیس مرحوم نے اس اراضی کو اپنے خاندانی مزاروں کے لئے حسب ضابطہ گورنمنٹ سے مستثنیٰ کرا لیا ہے اُس کے اندر مقبرہ کے طور پر ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا گیا

ہے جس میں چند قبریں ہیں مجھے یاد ہے کہ اس کمرے میں میر انیس مرحوم کی قبر کے سرہانے ایک مجلس کا مرقع بھی لگا ہوا تھا جسے داروغہ محمد خان نے میرے والدِ مرحوم کے انتظام سے تیار کرایا تھا۔

مرقع عہدِ شاہی کے فنِ تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ میر محمد علی صاحب مصور نے بڑی جانکاہی سے کھینچا ہے۔ ممبر کے قریب داہنی جانب میرے والدِ مرحوم کھڑے ہیں۔ میر صاحب کے ہاتھ میں جو مرثیہ ہے اُس پر یہ مصرع لکھا ہے ؎

برہم ہے مرقع چمنستانِ جہاں کا

اس مقبرے کا خیالی نظارہ پیش کرنے کے بعد اب میں اُس کا اصلی نقشہ بھی دکھائے دیتا ہوں اور اس کے اندر کی قبروں کا شمار بھی بتائے دیتا ہوں۔ کیوں کہ انقلابِ زمانہ پرانی یادگاروں کو مٹا رہا ہے۔ شاید کوئی وقت آجائے کہ ان بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے والے اس ثواب سے محروم رہیں تو اس کتاب میں شائع ہونے والے نقشے کے ذریعے سے وہ اُن قبروں کا پتہ لگا سکیں گے اور جن لوگوں کو اس خاندانِ بزرگ سے عقیدت و محبت ہے فاتحہ خوانی سے مثاب ہو کر نامہ سیاہ احسنؔ کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے ؎

نامِ نیکِ رفتگان ضائع مکن　　　تا کہ ماند نامِ نیکت یادگار

حُلیہ

سانولا رنگ، قد مائل بدرازی، چہرے کے نقش و نگار مجموعی طور پر خوشنما تھے۔ ورزشی جسم۔ ظاہر میں ایسے قوی اور فربہ نہ معلوم ہوتے تھے مگر دراصل چوڑا سینہ اور سڈول بازو جسم کی کساوٹ پر دلالت کرتے تھے۔ ورزش پابندئ اوقات میں داخل تھی۔ علاوہ ورزش کے دیگر فنونِ سپہ گری سے بھی باخبر تھے۔ ڈاڑھی باریک کترواتے تھے۔ اس معاملے میں صرف شرع کی پردہ داری منظور تھی اور اگلے بزرگوں میں کثرت سے ڈاڑھی کتروانے کا رواج پایا جاتا ہے۔ یہی صورت اُن کے فرزندِ رشید جناب نفیسؔ مرحوم کی ڈاڑھی کی بھی تھی کہ اکثر

لوگوں کو حلق کا شبہ ہوتا تھا مگر کیا پابندِ وضع لوگ تھے کہ جو صورت اختیار کی مرتے دم تک اُس کو نباہ گئے۔ آخر میں ضعفِ پیری نے اعضا میں تغیر پیدا کر دیا تھا مگر منبر پر پہنچ کر ایک خوبصورت نوجوان بن جاتے تھے اور خداداد قوت پیدا ہو جاتی تھی اور اُس وقت چہرے کی نضارت کا کچھ اور ہی عالم ہوتا تھا۔

اس کمرے کے اندر چھ قبریں ہیں جن کا پتہ نمبروار بتائے دیتا ہوں:
(۱) قبرِ ہمشیرۂ میر انیس (۲) قبرِ میر نفیس مرحوم (۳) قبرِ میر انیس مرحوم (۴) قبرِ میر مونس مرحوم (۵) قبرِ میر سلیس مرحوم (۶) قبرِ زوجۂ میر انیس مرحوم ۔ قبرِ دُختر مصنف متصل دروازہ و دیگر قبورِ اعزہ وغیرہ۔

مخدومی علی مرزا[۱] صاحب فرماتے تھے کہ ایک بات میر انیس میں میں نے حیرت ناک دیکھی۔ جب وہ مرثیے کا کوئی مقام رقت انگیز پڑھتے تھے اور جوشِ رقت سے خود بھی بے چین ہو جاتے تھے تو ضبطِ گریہ کی غرض سے نیچے کے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیتے تھے جس سے دہنی جانب کا رُخسار متحرک ہوتا تھا اور یہ موشن اُن کو لاکھ بناؤ دیتا تھا۔ اُن کو تو اس انداز

---

[۱] علی مرزا صاحب ایک بزرگ پٹنہ کے رہنے والے ہیں اور کلکتہ میں ایک کارخانۂ تجارت کی منیجری کی غرض سے سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ پٹنہ میں یہ بات مشہور ہے کہ میر انیس اپنی مرثیہ خوانی کے وقت علی مرزا صاحب کو زیادہ مخاطب کرتے تھے اور ایک اعلیٰ درجے کا سخن فہم سمجھتے تھے اور اس بات پر مرزا صاحب کو بھی ناز ہے اور یہ فخر کچھ بے جا نہیں۔ راقم سے کلکتہ میں ملاقات ہوئی تھی۔

سے یہی مقصود تھا کہ جوشِ گریہ سے آواز گلوگیر نہ ہو جو مانعِ خواندگی ہے مگر قدرتاً اس دلفریب ادا کی چوٹ ہر دل کو بے چین کر دیتی تھی۔ یہ نقل میرے سامنے بیان کرتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ فرماتے تھے واللہ اس وقت آنکھوں کے سامنے وہ تصویر پھر رہی ہے۔ میں نے کہا کہ کچھ اور حالات میر صاحب کے آپ کو معلوم ہوں تو فرمایئے جواب دیا کہ کیا بتاؤں اور کیا سناؤں۔ دل نے جو کچھ اُن کی صحبت اور شاعری کے مزے لیے ہیں زبان اُن کو بیان کرنے سے قاصر ہے پھر خاموش ہو رہے۔

میر صاحب کے انتقال کے وقت میری عمر سات سال کی تھی۔ زمانہ آخر میں جو مجلسیں میر صاحب نے پڑھی ہیں وہ مجھے خواب کی طرح یاد ہیں۔ مخدوم مکرم شیخ علی عباس صاحب کی پندرہ صفر کی مجلس میں سُننے کا اتفاق ہوا اور مرزا والا جاہ مرحوم کی مجلسوں کا نقشہ بھی خواب سا یاد آتا ہے۔ میرے نانا حکیم آغا حسن صاحب ازل مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ میں اس قدر کم سن تھا کہ ہنگامہ مجلس سے گھبرا جاتا تھا۔ کلام کے مشتاقوں پر عالمِ وجد طاری ہوتا تھا۔ منبر سے صفِ نعال تک ایک کافی بُعد اور فاصلہ تھا مگر اُن کا شیرانہ ہمہمہ ہر شخص کے کان تک پہنچ جاتا تھا۔ کم سنی کے سبب سے میں محاسنِ شاعری کی تمیز نہ کر سکتا تھا مگر اُن کی خواندگی کا اثر مجھے بھی محو کر دیتا تھا۔ میں مجلس میں بلند ہو ہو کر اُن کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے نانا حکیم صاحب مرحوم مجھے اپنے زانو پر بٹھا لیتے تھے۔ اُن کی سُریلی آواز کان میں گونج جاتی تھی۔ آواز میں ایک قسم کا لحن تھا۔ میر صاحب کی جو دُھندلی تصویر میرے حافظے میں تھی اس کی صحت میرے والد مرحوم نے کی تھی۔ میری یادداشت میں کسی قدر ترمیم بھی ہوئی ہے۔

لباس

ڈھیلی مُہری کا پاجامہ اور بارہ کلی کا کُرتہ پہنتے تھے اُن کا کُرتہ اتنا لمبا چوڑا ہوتا تھا کہ اُس پر

انگرکھا پہننے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ اُن کے ہمعصر ثقات کی وضع تھی۔ کُرتے کی دونوں آستینیں بہت باریک چُنی جاتی تھیں، جو چھلے دار ہو کر کہنیوں تک خود بخود چڑھ جاتی تھیں۔ چگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے جس کے ہر گوشے میں صُراحی اور کنٹھا یا چاندنے ہوتے تھے۔ سادہ اور سفید لباس سے زیادہ شوق تھا۔ سفید لباس میں اُس وقت کے رواج کے موافق جامدانی کے بیش قیمت کپڑے کا استعمال کرتے تھے یا ڈھاکے کی ململ کا کُرتہ پہنتے تھے۔ سچے ریشمی مشروع کا پاجامہ بھی اکثر پہنتے تھے۔ اُن کی مرضی کے موافق کپڑے کی تلاش میرے والد کے سپرد ہوتی تھی اور یہ خدمت اکثر اُنہیں سے متعلق تھی۔ کاندھے پر ایک رومال لنکلاٹ کا پڑا رہتا تھا ہاتھ میں سہروتی کی جریب۔ خوش مزاجی اور بذلہ سنجی میں تُنک مزاجی بھی شامل تھی اور یہ پُرانے اہلِ کمال کی ادا پائی جاتی ہے۔ خدائے سخن میر تقی میرؔ کے بھی دامنِ کمال میں بددماغی کا داغ لگایا گیا ہے اور ناسخ مرحوم کے حالات بھی اِس صفت سے خالی نہیں۔ دیکھو تذکرۂ آبِ حیات صفحہ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۲۰۰۔ فقیر احسن کے نزدیک یہ بددماغی اعلیٰ درجے کی تہذیب کا نمونہ ہے۔ کیونکہ جو لوگ خود مہذب ہوتے ہیں وہ اوروں سے بھی جوہرِ تہذیب کے خواہشمند رہتے ہیں اور ذرا سی بدتہذیبی اُن کی طبیعتوں میں اشتعال پیدا کر دیتی ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اِن اہلِ کمال نے تہذیب کو اخلاق پر بھی فوق دے دیا تھا کہ تہذیب کی حد قائم رکھنے کے لئے اخلاق کی کمی پر نظر نہیں ڈالتے تھے۔ ان بزرگوں کے واقعات کو بنظرِ انصاف مشاہدہ کرو تو اُنہوں نے کوئی بدمزاجی بے سبب نہیں کی ہے تاوقتیکہ کوئی سبب محرک نہ ہوا ہو۔ میر انیس کے واقعات میں ایسے اکثر ذکر آجائیں گے جس پر ایک اخلاقی اعتراض پیدا ہوگا۔ مگر واقعات کی تہ میں کوئی سبب پیدا ہو جائے گا۔

غذا

میر صاحب مرحوم بہت قلیل غذا کھاتے تھے شب کو یخنی دن کو دودھ اور کچھ فواکہ

سادہ گوشت کا قلیہ یا قورمہ۔

اُنہوں نے تمام عمر کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ مناظرہ فی نفسہٖ بداخلاقی ہے۔ اساتذۂ متقدمین کو بے حد مناظرہ کا شوق تھا اور شاعرانہ مناظروں سے اعتراض ہوتے تھے یہاں تک کہ علمی مناظروں سے قطع نظر کر کے ذاتیات تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ اہاجی رکیکہ کی بنیادیں اسی اعتراض کی بدولت قائم ہوئیں، جن سے مشاہیر قدیم کی تصنیف لبریز ہے۔ مصحفی، انشاءاللہ خان، سودا اور جرأت کی شاعری کے رخسارِ زیبا پر ہجوؤں کا بدنما داغ اب تک موجود ہے۔ ان بزرگوں کے گلزارِ نظم کی سیر کرنے والوں کو ہر روش پر فحش و ہجو کے کانٹوں سے دامن بچانا پڑتا ہے۔ پھر ایسے سب و شتم کے سامنے بدمذاقی کی وہ حرکت جو شاعرانہ پہلو لئے ہوئے ہو نہایت کم وزن اور ناقابلِ توجہ ہے کیونکہ اُس انداز میں اشارات و تلمیحاتِ شاعرانہ پائے جاتے ہیں۔ دوسرا ایک سبب اور بھی ہے کہ ان کی سپاہیانہ نسلوں کا زمانہ بہت قریب تھا اور اُن کی رگوں میں سپاہیانہ خون کی ودیعت شوریدہ مزاجی کا سبب پائی جاتی ہے۔ اب مورثِ اعلیٰ سے موجودہ نسل کو کافی فاصلہ ہو گیا اور زمانہ جس قدر آگے بڑھا موجودہ تہذیب و تمدن نے مزاجوں میں دخل پیدا کر لیا اس لئے پُرانے لوگوں کی یہ معمولی لغزشیں قابلِ فروگذاشت ہیں۔ خطائے بزرگان گرفتن خطاست۔

استغنا

مالِ دُنیا کی جانب سے وہ منہ پھیرے ہوئے تھے۔ اگرچہ کثیر العیالی اور دُنیاداری کے اعتبار سے اس کی نہایت ضرورت تھی مگر غیور تھے صاحب ہمت تھے اور گراں باریِ احسان کے متحمل نہ تھے۔ یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اغنیا کے منت پذیرِ ایثار و کرم نہ تھے تو ما یحتاج کا بابِ آمدنی کیا تھا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اُنہوں نے اُمرا یا اولیا

کی طرح فقر و قناعت میں زندگی بسر کی مگر یہ بھی ہے کہ دولت مندوں کے خزانوں پر حریصانہ نظر نہیں ڈالی وہ صرف خاص خاص لوگ تھے جو اُن کے ساتھ سلوک و مراعات فخر دنیوی اور مفادِ آخرت سمجھتے تھے اس لیئے طبع کا شرمناک لفظ اُن کی کتاب قناعت میں کبھی استعمال نہیں ہوا اور نہ اُنھوں نے اس لفظ کے معنی سے فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنے شعارِ طبیعت کی جانب سلام کے اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں ؎

کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دیدے   فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے

اہلِ کمال کے نظامِ تاریخی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت حرص و ہوس سے قدرتاً نفور تھی اور اُن کی خواہشوں نے قناعت کی چار دیواری سے قدم باہر نہیں نکالا اُن کی آرزوئیں ایک محدود دُنیا کی سیر کرنے والی تھیں۔ اُن کے خرمن علم و ہنر کی دولت سے مالا مال دُنیا کے سامانِ آرائش پر اُن کو رغبت نہ ہوئی گویا وہ دنیا میں نہ تھے اور نہ دُنیا اُن کے واسطے۔ ان کی فرضی اور خیالی دنیا میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ شاعرانہ خیالات مطلوبہ چیزیں فراہم کر دیتے تھے۔ آسمان کے تارے اور سمندر کے موتی وہ بادشاہوں کو بخش دیتے تھے اور اُن کے علم و ہنر کا خزانہ خالی نہ ہوتا تھا۔ میر تقی میرؔ کو کسی رئیس نے رہنے کے لیئے مکان دیا۔ اُس میں خانہ باغ بھی بنا تھا۔ مکان کی کھڑکیاں باغ کی جانب کھلتی تھیں۔ میر صاحب مُدت تک رہے مگر ایک روز بھی توجہ نہ ہوئی کہ کھڑکیاں کھولیں۔ حسبِ دستور ایک روز صاحبِ خانہ ملاقات کو آئے اور اتفاق سے دریافت کیا کہ جناب آپ ان کھڑکیوں کو کس وقت کھولتے ہیں کیوں کہ میں جب کبھی آیا ان کو بند ہی پایا۔ میر صاحب نے کہا کہ میں نے ایک روز بھی کسی کھڑکی کو نہیں کھولا اور کیوں کھولوں۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ صاحب خانہ مُسکرائے اور کہا کہ اس کمرے کی پُشت پر باغ ہے اور یہ مکان میں نے آپ کو اس لیئے دیا تھا کہ آپ شاعر ہیں اور شاعروں کو ایسے مکانوں سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ میر صاحب نے فرمایا مجھے اپنے باغ کی سیر سے فرصت ہو تو اس مکان کے باغ کی سیر کروں۔ در حقیقت شاعرِ فطری کو سوائے شاعرانہ خیال کے اور کسی چیز

سے وابستگی نہیں ہوتی۔ خیالاتِ شاعرانہ کا ہجوم عالمِ خلوت کو بھی ہنگامہ آرا بنا دیتا ہے۔ ؎

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

میر انیسؔ کو زینت و دولت سے بھی لاپروائی تھی اُن کی ضرورتیں بہت سادہ تھیں۔ اُن کی خواہش محدود اُن کے ارادے سنجیدہ۔ کائنات کی بیش بہا اجناس سے دو کم قیمت چیزیں انہوں نے انتخاب کیں۔ ایک معمولی قلم اور دوسرا کاغذ کا ٹکڑا اور اُسی کے ذریعے سے خدا کی خدائی کے مالک بن گئے۔ چھپر کھٹ کے سونے والوں کی طرح دولت مندی کے دلفریب خواب اُنہوں نے کبھی نہیں دیکھے۔ ملکِ عدم کے باشندے اگر آج دُنیا میں واپس کر دیئے جائیں تو اگلی غلط فہمیوں کا اعتراف کرکے فقر و قناعت کی زندگی پسند کریں گے۔ بادشاہ اپنے تخت سے معزول ہو کر ایک معمولی انسان رہ جاتا ہے۔ میر انیسؔ اپنے منبر سے اُتر کر بھی میر انیسؔ ہی رہے۔

مذہب

وہ شیعہ مذہب کے آدمی تھے مگر اُن کی تصنیف تعصباتِ مذہبی سے خالی ہے۔ اُن کا کوئی خیال کسی کے لئے دل شکن نہ تھا۔ یہاں تک کہ سُنّی اور شیعہ مذہب کے مابہ النزاع مسائل سے بھی مرثیوں میں بحث نہیں کی گئی ہے۔ اُن کا مرثیہ اہلِ اسلام کے ہر فرقے کے لوگ بے حد اشتیاق سے پڑھتے ہیں اور پڑھ سکتے ہیں اور ہر مذہب کی انجمنوں میں پیش کرنے کے قابل ہے۔ مذہب کے پکے علماء تو اُن کے عقائدِ مذہب کے متعلق روشن رائے دے چکے ہیں لیکن معقولات سے بحث کرنے والے فلسفی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ وہ پکے دیندار تھے۔ ابنِ رشد کا قول ہے کہ فلاسفہ کے خیال میں سچا اور خالص مذہب وہی ہے کہ انسان موجوداتِ عالم پر غور کرے اور اُن کی معرفت میں باریک بینی سے کام لے اور یہ بہترین

طریقِ عمل ہے۔ پس ظاہر ہے کہ میر انیس کا خیال ہمیشہ مظاہرِ قدرت و روحانیات و معرفتِ حقائق کے گرد طواف کرتا رہا ہے اور تزکیۂ نفس سے انہوں نے موجوداتِ عالم میں اُس طاقت کو مان لیا جو خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے۔ یہی خیال باعثِ تکمیلِ نفسِ انسانی ہے اور اسی کو مذہب سمجھنا چاہیئے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ دہیں سے ایک مذہب کے پیشوا بنا کر بھیجے گئے تھے۔ دُنیا میں آکر انہوں نے کوئی نیا مذہب اختیار نہیں کیا ست

از مذہبم مپرس مسلمان کہ کافرم　　من رسمِ ایں دیارندانم مسافرم

استعدادِ علمی

میر انیس نے درسیات کی ابتدائی کتابیں قبلہ و کعبہ میر نجف[1] علی صاحب سے فیض آباد میں پڑھی ہیں اور لکھنؤ پہنچ کر مولوی حیدر[2] علی صاحب سے عربی کی تکمیل کی۔ میر انیس کی استعدادِ علمی کی بابت لوگوں کے مختلف خیال ہیں اور اُن کی زندگی میں بھی اُن کے پیمانۂ علم کا عمق کسی ذہن کی گہرائی سے ناپا نہیں جا سکا وجہ یہ ہے کہ صنفِ مرثیہ میں اُنہیں اظہارِ علم و فضل مقصود نہ تھا۔ اُن کی نظم فصاحت کے آبِ حیات میں ڈوبی ہوتی تھی بے محل لفاظی اور بے موقع شوکتِ الفاظ سے احتراز تھا۔ اُن کی تحریر اور تقریر دونوں میں متانت تھی۔ تحریر میں اُن کا طرزِ شاعری سہل الممتنع واقع ہوا تھا اور تقریر میں وہ مناظرہ اور مباحثہ کو معیوب جانتے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ خود ستائی کی عادت نہ تھی۔ وہ اپنی زبان سے اپنی تعریف کے قصیدے فصاحت و بلاغت سے پڑھنا پسند نہ کرتے تھے۔ شاعرانہ مضامین کے پیرایہ میں جوہرِ ذاتی کے اظہار پر

---

[1] میر نجف علی صاحب ایک بزرگ فاضلِ مستند صاحبِ اجازہ فیض آباد میں تھے۔

[2] مولوی حیدر علی صاحب عالمِ جید لکھنؤ میں تھے اُن کے نام سے ایک مسجد محلہ کٹرہ حیدر حسین خان لکھنؤ میں اب تک موجود ہے۔

فخر و مباہات کرتے تھے۔ شائستگیِ مزاج اور درستیِ تہذیب کی وجہ سے وہ اپنی زبان سے کم اور قلم سے زیادہ کام لیتے تھے۔ سمندر جس کا مغرور سر آسمان کے منہ پر تھوکتا ہے اُس کے خاموش پانی میں بیش بہا گوہر نایاب پوشیدہ ہوتے ہیں اور برسات کے جوش سے عارضی شور کرنے والے نالوں میں گدلا پانی بہتا ہے۔ درحقیقت صاحب کمالان والا جوہر کی خاموشی میں زنگارنگ تحقیق و معلومات کے راز پوشیدہ ہیں۔ نسیم سحر کی سُبک رفتاری شاداب باغوں کی کلیاں کھلاتی ہے اور بادِ صرصر کے تُند و تیز جھونکے اُنہیں پھولوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ جن متانت پسند دماغوں سے حسبِ ضرورت مختصر فقرے نکلے ہیں وہ اصُول کے کانٹے میں تُلے ہوئے اور قانون کی پرکار سے نپے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسان ناطق ہے مگر نطق کی یہ تعریف نہیں کہ قوّتِ ناطقہ کے ہیجان سے زبان سا نازک عضو جس کو خدا نے بھی بمصلحت دہن کے خزانے میں محفوظ رکھا۔ بلا ضرورت تکلیف پہنچائی جائے۔ جس طرح جوہر دار تلوار ضرورتِ استعمال کے وقت میان سے باہر نکلتی ہے اسی طرح جوہر دار زبان حُسنِ بیان کے لئے پہلو بدلتی ہے۔ اہلِ علم کی خاموشی علامتِ بلند خیالی ہے۔ خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمے آید۔ مغربی اہلِ قلم نے اِس لفظ کی تعریف میں علم کے دریا بہائے ہیں دیکھو (ڈورےؔ گیلرے)۔ اس لئے میر انیسؔ کے خیالاتِ شاعری منتشر نہ ہوئے اور محفوظ رہے جو وقتاً فوقتاً بیش بہا جواہر بن کر ذہن کی کان سے نکلے جن کو اہلِ علم نے اپنے کان کا گوشوارہ بنالیا۔

یہی کیفیت میرے اُستاد میر نفیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ کی بھی تھی یالولد سر الابیہٖ دورانِ مرثیہ خوانی میں اگر کسی واقعے کی نسبت نثر میں کچھ بیان کرنا چاہتے تھے تو بہ تکلف رُک رُک کر اظہارِ مدعا

ؔ ڈورے لندن کا آرٹسٹ ہے اور شاعر بھی ہے۔ اس نے یہاں تک خاموشی اختیار کی تھی کہ بات کا جواب تصویر سے دیتا تھا جو سائل کے لئے جواب کا کام دیتی تھی۔ چونکہ ارسطو نے فنِ تصویر کشی کو داخلِ شاعری کردیا ہے اس لئے اس کی تصنیف سے ہمارے مضمون کو خاص تعلق ہے۔

کرتے تھے مگر نظم میں مضامینِ عالی کے دریا بہا دیتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایسے خاموش انسان کی نظم میں یہ جوشِ مضامین و افراطِ جذباتِ شاعری کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو طبیعتیں جامع ہوتی ہیں، وہ اپنے تصرفات سے باز نہیں رہ سکتیں، بدیں وجہ اُن کے اکثر حصہائے نظم معلوماتِ علمی کا معیار بن گئے ہیں۔ ہم عصروں نے اُن پر اعتراضوں کے بزدلانہ حملے بھی کئے ہیں مگر بالمواجہہ کسی کو اُن سے مناظرہ کی ہمت نہ پڑی۔ اُن کی تمام لائف مناظرہ سے پاک وصاف ہے۔ مرثیہ یا سلاموں میں کہیں کہیں شاعرانہ شوخی یا سخن گسترانہ اشارات پائے جاتے ہیں اور یہ معمولی طریق شعراء ہے، دراصل کسی جانب رُوئے سخن نہیں، چند واقعات شوخ مزاج لوگوں کی بدولت زیادہ مشہور ہو گئے ہیں۔ مثلاً میر انیس مرحوم نے کسی مجلس میں ایک سلام پڑھا (حسینوں کو، مہ جبینوں کو) اس زمین میں میر صاحب کے ایک شعر کی عالمگیر شہرت ہوئی ہے

یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے   چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

مرزا صاحب مغفور کو یہ زمین پسند آئی اُنھوں نے بھی سلام کہا اور کسی مجلس میں پڑھے۔ بلے فکروں کو شگوفہ ہاتھ لگا۔ معمولی بات کو میر صاحب کے سامنے رنگ آمیزیوں سے بیان کیا۔ رشک فن داخلِ خواصِ شعراء ہے، خصوصاً ایسا شخص جس کی طبیعت فطرتاً تقابل پسند نہ ہو۔ میر صاحب کی برہمیِ مزاج کے لئے یہ لطیفہ کافی تھا۔ پھر تو دونوں جانب سے طبع آزمائیاں شروع ہو گئیں۔ بلند پروازیوں نے زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔ دونوں صاحبوں کے سلام کلیاتِ مطبوعہ میں موجود ہیں اس لئے میں یہاں اُن کے لکھنے کی ضرورت نہیں دیکھتا۔ اہلِ لکھنؤ نقدِ دل لگی دیکھنے والے تھے۔ اپنے شہر کے دو نامی شاعروں کی تحقیر منظور نہ تھی۔ جب مقابلے کا لُطف اُٹھا چکے تو آپ ہی اصلاح کی کوشش کی۔ چونکہ میر و مرزا کی طبیعتیں بغض و نفسانیت سے پاک تھیں۔ صفائی ہو گئی اور قصہ رفع ہو گیا۔ اسی طرح ایک معرکہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے۔ میر صاحب مرحوم کے ایک مرثیہ کا مطلع ہے ۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

ایک صاحب نے غائبانہ اعتراض کیا یعنی آفتاب اور مسافتِ شب کا طے کرنا ایک تازہ خیال ہے۔ مسافتِ شب ماہتاب طے کرتا ہے نہ کہ آفتاب۔ بات مشہور ہوگئی، اور غمازوں نے میر صاحب کے کان تک پہنچا دی۔ والدِ مرحوم فرماتے تھے کہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور اس اعتراض کا واقعہ بیان کیا۔ میر صاحب کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور دو مرتبہ فرمایا خیر دیکھا جائے گا اور پھر خاموش ہورہے۔ دوسری مجلس میں جب میر صاحب منبر پر تشریف لے گئے تو مرثیہ شروع کرنے سے پہلے حاضرین کی جانب مخاطب ہوکر فرمایا۔ سُنتا ہوں کہ کسی صاحب نے انیسؔ پر اعتراض کیا ہے۔ ممکن ہے کہ باعتبارِ تقاضائے بشریت مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو مگر میں اُس کو مخاطب صحیح نہیں سمجھتا جو ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔ اگر مردِ میدان ہے برسرِ معرکہ اعتراض کرے۔ اب میں منتظر ہوں کہ کسی جانب سے آواز آئے تاکہ میں اعتراضی شکوک لوگوں کے دلوں سے دُور کردوں۔ پھر خاموش بیٹھے ہوئے اہلِ مجلس کو دیکھا کئے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ کوئی آواز بلند نہ ہوئی اور وہ شیرِ بیشۂ فصاحت بہت دیر تک بیٹھا ہوا منبر پر جھوما کیا۔ آخر نواب محمد حسین خان صاحب نے اُس مہرِ خاموشی کو توڑا اور نہایت ادب سے عرض کیا کہ حضور کا کیا خیال ہے۔ کس کی مجال ہے جو آپ پر اعتراض کرے۔ میرے نزدیک یہ سب مفسدہ پردازوں کی باتیں ہیں۔ بسم اللہ مرثیہ شروع کیجئے مجلس مشتاق ہے۔ اُس پر بھی اُن کا جوش کم نہ ہوا جب تک علمِ ہیئت کے استدلال سے فاصلۂ شب میں دَورۂ شمسی کو ثابت نہ کر دیا۔

ایک مرثیہ میں میر انیسؔ مرحوم گھوڑے کی سُبک روی میں ایک غیر مانوس استعارہ صرف کرگئے ہیں اُس بند کے چار مصرعے یہ ہیں ؎

پامال نہ ہوں پھول جو گلزار پہ دوڑے	سُم تر نہ ہوں گر قلزمِ زخار پہ دوڑے
اس طرح رگِ ابرِ گہر بار پہ دوڑے	جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

چوتھا مصرعہ اس بند کا معرضِ اعتراض میں ہے۔ شعرائے حال کی طبیعتیں ایجادات و اختراعات کی جانب مائل نہیں ہوتیں۔ تشبیہہ جدید بغیر فکرِ بلیغ غیر ممکن ہے اس لئے تشبیہہ و استعارات کا دائرہ بھی تنگ نظر آتا ہے۔ شاعری اور زبان دونوں کی توسیع کے لئے اختراعات کی ضرورت ہے۔

سائنس نے معلوماتِ انسانی میں جو اضافہ کیا اور اُن کے وقت میں اِس ایجاد نے رواج پایا اس لئے شاعر کا ذہنِ رسا اس کرشمے کی جانب منتقل ہو گیا۔ معترض کو ایک انوکھا خیال محسوس ہوا۔ وجہِ شبہ کی اصلی ماہیت سے تو واقفیت نہ تھی، اعتراض یہ کیا کہ بجلی کی آواز تار پر نہیں دوڑتی بلکہ حرکت دوڑتی ہے۔ یہاں میر انیس کی الہامی طاقت نے اپنی پوری قوت دکھائی ہے اور علمِ طبیعات سے ثابت کیا ہے کہ حرکت آواز کے ذریعے سے روانی پیدا کرتی ہے۔ مادّی اشیاء میں جب تصادم ہوگا آواز یقینی پیدا ہوگی۔ تجربوں سے ثابت ہے معدنیات کے کبریتی مادّے بھی نقل و حرکت میں آواز پیدا کرتے ہیں۔ وہ فاصلہ جو مادّہ برقی کے خلا میں واقع ہے آواز سے مملو ہے خواہ وہ آواز مسموع ہو یا نہ ہو۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے مابہ النزاع مسئلہ کا عملی ثبوت ہمارے زمانے میں نمایاں طور پر پیش کر دیا ہے۔ مختلف شہروں میں برقی طاقت سے جو ٹرام جاری ہے اور بجلی کا وہ تار جس کا تعلق گاڑی کو دھکیلتا ہے اس کی آواز ہر شخص سُن سکتا ہے۔ گاڑی جس قدر قریب آتی جاتی ہے آواز میں سنسناہٹ کے ساتھ وزن پیدا ہوتا ہے اور جب قریب سے گذر جاتی ہے اور فاصلہ بتدریج بُعد پیدا کرتا ہے تو آواز نرم اور کم وزن ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ آواز موجود رہتی ہے مگر بسبب بُعدِ فصل محسوس نہیں ہوتی۔ اب اس تشبیہہ کی باریکی پر غور کرو جس نے اپنی نزاکت کی وجہ سے معترض کے خیال کو مغالطہ میں ڈالا ہے۔ اگر بجلی کا تار محض خبر رسانی کا تار سمجھا جائے اور دوسری ایجاداتِ برقی سے کوئی علاقہ نہ رکھا جائے تب بھی وہ فرضی اشارات جو علمِ تار برقی سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے موشنس آواز ہی کے ذریعے سے مفہوم ہوتے ہیں۔ جس میز پر برقی خزانے کے تعلق سے تاروں کا جال پھیلایا

66234

گیا ہے اور ہر تار ایک دوسرے سے مسلسل ہے۔ اس کی چابیوں پر مختلف الوضع ضربیں لگانے سے جو آوازیں اشاراتِ مقررہ کے مبداء میں پیدا ہوتی ہیں ویسی ہی ہم شکل و ہم وضع منتہی میں پہنچ جاتی ہیں۔ اور اگر ان آوازوں میں اتفاق نہ ہو تو مخبر الیہ مخبر عنہ کے مقاصد سے واقف نہیں ہو سکتا۔ جہاں کہیں بجلی کی قوتِ جاذبہ اشارات کو ختم کرتی ہے وہاں آواز ہی کے ذریعے سے مطالب مفہوم ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ طاقت کہاں تک۔ اور کس کس صورت میں ترقی کرے گی کیوں کہ برقی طاقت کی نسبت باوجود اختراعاتِ جدیدہ سائنس کی تحقیقات ناتمام ہیں۔ مسٹر بنجمین فرنکلن امریکن نے جو یورپ کا ایک مشہور سائنٹسٹ ہے ۱۷۰۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۵۲ء میں اس فن کو معلوم کرکے اس سے عمل شروع کیا۔ آلات سے حرکات پیدا کیئے جن سے رفتہ رفتہ آلات کی زد کو حروف کی صورت میں متشکل کیا یا یوں کہو کہ ٹیلیگراف اور ہیلیوگراف کے اشارات کو چھوٹے بڑے نشانات میں منقسم کرکے حروف بنائے اور حروف سے الفاظ۔ یہ طاقت مختلف اجزا سے پیدا کی جاتی ہے جو بذریعہ انسٹرومنٹ کام میں لائی جاتی ہے۔ دیکھو الرفیق۔

اب خیال کو ایک معمولی سی بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ اس آواز کو بجلی کی آواز کہیں یا نہ کہیں مگر بجلی کی آواز کہنا لازمی ہے کیوں کہ اگر مادۂ برقی معین نہ ہو تو صرف تار اتنی سرعت سے اس سلسلہ کو ختم نہیں کر سکتا۔ قطع نظر اس کے اس ترکیب کو معانی و بیان والے ترکیبِ مجازِ مرسل بھی کہتے ہیں اور اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کہے کہ چراغ جلتا ہے تو اعتراض پیدا ہوگا کہ چراغ اُس چیز کا نام ہے جو مٹی کا ایک ظرف ہے اور اُس میں تیل بھرا ہوا ہے مگر وہ تو نہیں جلتا تو پھر کہا جائے گا کہ تیل جلتا ہے تو تیل کا جلنا بھی ایک تیسری چیز ہے بتی کے ذریعے سے ثابت ہوگا۔ آخر اس صغریٰ کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ چراغ جلتا ہے۔ اسی طرح آسانی اسی میں پائی جاتی ہے کہ بجلی کی آواز کہیں تاکہ علمِ تار برقی کی تحلیل و تفصیل کی ضرورت باقی نہ رہے۔ آج اس مرثیہ کی نقلوں میں بجلی کی جگہ نعرہ کا لفظ بھی پایا جاتا ہے۔ مگر میں اول الذکر کو صحیح سمجھتا ہوں

کیوں کہ میر صاحب نے اس لفظ کی نسبت خود محاکمہ کیا ہے اور اس کی صحت عظیم آباد کے چند ثقات حضرات سے میں نے کی ہے جن کا بیان ہے کہ ہمارے سامنے میر صاحب نے اس مصرعہ کو یوں ہی پڑھا ہے ؎

جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

اور شاعر کا مطلب بھی اسی سے ہے کہ جس طرح آواز برقی تار کے ذریعے سے تیک رو و سریع السیر ہے اسی طرح گھوڑے کی تیک رفتاری میں سرعت داخل ہے۔ اب دوسرا اعتراض ان چاروں مصرعوں کی ردیف کے مذموم پہلو پر ہے اوّل تو ردیفین من حیث الاعراب ذم کے پہلو سے محفوظ ہیں اور اگر یہ کم وزن اعتراض بالفرض مان لیا جائے تو اساتذۂ متقدمین کے کلام سے ایسی بے حد مثالیں مقتبس ہو سکتی ہیں جو ہمارے اعتراض کا کافی جواب ہیں۔ اور یہ معمولی باتیں قابلِ غورِ اربابِ کمال نہیں بلکہ باعثِ ضعفِ خیالِ معترض ہیں۔

ایک اور اعتراض میر انیس کی مرثیہ خوانی پر عاید کیا جاتا ہے جو (موشنس) کے متعلق ہے۔ مگر یہ اعتراض ایک گروہِ خاص تک محدود ہے۔ جو طبیعتیں جذباتِ صحیحہ کی برقی کیفیت سے واقف ہیں وہ خوب سمجھ سکتی ہیں کہ یہ فعل اضطراری ہے۔ ارادی نہیں ہے۔

شاعرانہ مضامین جب تک فضائے عالمِ خیال میں گردش کرتے رہتے ہیں اور اُن کے لئے کوئی ہیولا قائم نہیں ہوتا اُس وقت تک قوائے غیر مادی میں حرکت رہتی ہے۔ یعنی مدرکہ، ممیزہ متخیلہ۔ واہمہ وغیرہ میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور ان قوتوں کے تصادم سے شعر ایک جسم معنوی پیدا کرتا ہے اور تکلم کے ذریعے سے معرضِ اعلان میں آتا ہے۔ اُس وقت قوائے مادی جذباتِ کامل کے اظہار میں مدد دیتے ہیں اور جذباتِ شاعرانہ کا اثر اعضاء پر ختم ہوتا ہے اور یہ حرکت فطری طور پر واقع ہوتی ہے۔ شاعر پہلے سے کسی اندازِ خاص کا ارادہ نہیں کرتا۔ صرف تاثیرِ جذباتِ صادقہ کی وجہ سے بے خودی پیدا ہو جاتی ہے اس وجہ سے نظم کو شاعر ہی اچھی طرح پڑھ سکتا ہے کیوں کہ وہ اُس کے پُر تاثیر الفاظ کے موشن[1] سے بخوبی واقف ہے اور منازلِ شاعری کے

(لہ دیکھو صفحہ آیندہ)

کے پیچ وخم کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کیفیات قدرتی طور پر انسان کے اعضاو رئیسہ پر عمل کرتے ہیں غم اور مسرت یہ دونوں حالتیں ایسی حاوی ہیں کہ ان سے کوئی شاعرانہ خیال خالی نہیں فقط متکلم ہی ان کیفیات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ سامع بھی جو مذاقِ شاعری رکھتے ہیں اثر پذیر ہوتے ہیں۔ شاعر کے احساسات وجذبات ناتمام رہتے ہیں جب تک وہ اصولِ خواندگی پر زور نہیں دیتا، عمدہ سے عمدہ نظم کا اثر فنا ہو جاتا ہے۔ اسپیکروں کے ایک ایک لفظ کا اثر سامعین کے دلوں میں بجلی کی طرح اُتر جاتا ہے۔ اور وہ مشین کیا ہے جس کے ذریعے سے یہ اثرات دل میں اُتارے جاتے ہیں۔ پست وبلند آواز کی تبدیلی اور چشم وابرو کے اشاروں کے ساتھ چہرے کا تغیر اور اعضا کی حرکت یہ سب خیالات تخئیلِ شاعری کے ترجمان ہیں۔ جناب اشہری اپنی تصنیف میں فرماتے ہیں کہ میں نے میر انیسؔ کو پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ وہ فقط ابرو کے اشارے اور گردن کی حرکت سے کام لیتے تھے۔ اس امر میں عقلی اور نقلی طور پر مجھے اعتراض ہے۔

میر انیسؔ کا پڑھنا ہنگامہ آرا تھا اور وہ جس مقام کو پڑھتے تھے تمام قوتوں سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک مصرعہ تو مجھے بھی یاد ہے جو فعل مطبوع ومرغوب دل ہوتا ہے وہ انسان کو اچھی طرح یاد رہتا ہے۔ اس وجہ سے سات سال کی عمر میں سُنا ہوا مصرعہ میرے

لہ لندن میں موشنس (علمِ اشارات) کے اسکول جاری ہے اور بڑے بڑے اہل علم اسپیکر اُن اسکولوں میں تعلیم کی غرض سے داخل ہوتے ہیں۔ میرے مخدوم ومکرم جناب حامد علی خان صاحب بیرسٹر نے مجھ سے بیان فرمایا کہ میں نے خود اُس مقام پر تعلیم پائی اور میں نے مدت تک اس فن کو حاصل کیا ہے آواز کا چیچ کرنا اور چہرے کے تغیرات کو جذباتِ شاعرانہ سے بہت کچھ تعلق ہے۔ بہت فن ہیں جو ہندوستان میں بنظرِ حقارت دیکھے جاتے ہیں مگر اُن کو گورے چہرے اور بھورے بالوں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ ہندوستان نے ابھی ترقی کے اُن زینوں پر قدم نہیں رکھا۔

حافظے میں اس وقت تک محفوظ ہے اور اُس کے موشنس کی تصویر اب تک پیشِ نظر ہے۔ مصرع

داشتوں میں شجاعانِ عرب ڈاڑھیاں دابے

مرثیے کو زانو پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو ڈاڑھی کے قریب لاکر اس طرح گردش دی اور ہونٹوں میں فرضی ڈاڑھی کو دبایا کہ یہ معلوم ہوا کہ عرب کے شجاع سپاہیوں کی حالتِ جنگ میں جوشِ شجاعت کی تصویر کھینچ دی ہے۔

ایک دوسری توجیہہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ چونکہ ہر جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے اور ہر مادہ اپنے مادے کو کھینچتا ہے لہٰذا شاعری کا جرِثقیل یہی ہے کہ وہ آواز (جس کو نظم یا شعر جو کچھ کہیں) شاعر کی زبان سے نکل کر سامع کے دل میں اُتر جائے کیوں کہ وہ خیال دل ہی سے پیدا ہوا ہے اور دل ہی میں ساری ہوتا ہے۔ جس طرح مسمریزم کا عامل اپنے معمول پر عمل کرتا ہے اُسی طرح شاعری کا مسمرائز سامعین کی قوتوں پر دخل پیدا کرتا ہے اور یہ بے خودی اپنے سچے اثرات کے ذریعے سے اعضا میں حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ متکلم ہو یا سامع۔ جو لوگ ان حرکات میں حدِ اعتدال سے گذر جاتے ہیں وہ گویا اس کیفیت کے پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو شاعر میں خود بخود پیدا ہونا چاہیئے اس لیئے وہ موشن مصنوعی معلوم ہوتا ہے اور ایسے خلافِ فطرت اندازِ خوانندگی بہت جلد شناخت کر لیئے جاسکتے ہیں۔

جب کوئی شخص میر صاحب مرحوم سے اندازِ مرثیہ خوانی سیکھنے کی خواہش کرتا تھا تو وہ اس سوال سے بہت منغص ہو جاتے تھے۔ راقم کے والدِ مرحوم نے ایک روز اس کا سبب دریافت کیا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ جب کوئی شخص مجھ سے اصولِ خوانندگی سیکھنے کی خواہش کرتا ہے تو میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ کیا سیکھے گا اور میں کیا سکھاؤں گا۔ بھائی یہ کچھ سیکھنے کا فن ہے! وقت پر جو کچھ ہو جاتا ہے ہم خود نہیں سمجھتے کہ ہم نے کیا کیا کوئی فن کیوں نہ ہو جب تک انسان کو فطرتاً اُس سے لگاؤ نہ ہو اکتساب سے تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ جذباتِ اصلی سے وہی شخص ماثور و مغلوب ہوگا جو خود شاعر ہو یا کم از کم شاعرانہ باریکیوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو، خود مصنف ہو اور

خود خوانندہ تو دادِ کمال و ستائشِ محاسنِ شاعری سے اندازِ خوانندگی میں حسن پیدا ہو جاتا ہے اور بغیر فیضانِ قدرت اگر میں تمام عمر اپنا اور اُس کا دماغ پریشان کروں پھر بھی منبر پر پہنچ کر ایک مصرع بھی با قاعدہ نہ پڑھا جائے گا پھر اس فن کے سیکھنے سے فائدہ! واقعی ہم نے دیکھا ہے کہ اس خاندان کے اکثر شاگرد جن کی عمر کا کافی سرمایہ اس شغل میں بسر ہوا مگر واللہ جو پڑھنا آیا ہو ؎

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند

کار پردازانِ قضا و قدر نے اس فن کی ودیعت اس خاندان میں رکھی ہے اور حیرت انگیز قدرتی تعلیم ہے کہ ایک کے بعد دوسرا پیدا ہوتا ہے اور اپنا رنگ جماتا ہے۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں میگویم

شاعری

شاعری فی نفسہٖ کیا ہے اور لوازمِ شاعری کس قدر ہیں اس وقت ہم اس سے بحث نہیں کریں گے۔ ارسطو سے لگا کے موجودہ زمانے کے عالی دماغ اہلِ قلم تک اِس لفظ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور واقفانِ رموزِ شاعری نے اس مضمون پر اپنی معلومات کے دریا بہا دیئے ہیں مجھے اس وقت صرف میر انیسؔ کی قسم شاعری سے غرض ہے اور اُن کی شاعری کی مدح سرائی کے لئے دُنیا کی ڈکشنری میں بڑی تلاش سے ایک لفظ ملتا ہے یعنی فصاحت اور اس لفظ کی تشریح میں علومِ متنوعہ مستعمل ہیں۔ فصاحت کی طنابیں اُن کے ہاتھ میں ہیں اور حسبِ ضرورت گھٹا بڑھا رہے ہیں۔ دُنیا کے اہل الرائے متفق ہیں کہ ان کی شاعری اکتسابی نہ تھی۔ وہ شاعرِ وہبی تھے۔ اُنہوں نے اُردو علم و ادب کے خزانوں کی مہریں توڑ ڈالیں اور بیش بہا جواہرات پر قبضہ کر لیا۔ وہ اس خزانے کو ملک کے ہر گوشے پر تقسیم کر گئے۔ اہلِ زبان اُن کے احسانات سے گرانبار ہیں۔

MALIKRAM COLLECTIO

اُنہوں نے شاعری کی سنگلاخ زمین کے چپے چپے پر ایسی داغ بیل ڈالی جس کے سہارے سے آج فصحائے زبانِ اُردو منزلِ مقصود کے راستے طے کر رہے ہیں اور انہیں نشانات سے تحقیق کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

اُن کی روشن خیالیوں نے فصاحت کا آبِ حیات پردۂ ظلمات سے نکال لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس فلسفیِ زبان کا نام اب تک زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔ گو عزت نے اپنا فرض پورا کرنے میں کمی نہ کی مگر شہرت کمال کے نقش وہ بھی نہ مٹا سکی کیا خوب فرماتے ہیں:

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

اُن کے پاکیزہ خیالاتِ شاعری جو فصاحت کے سرچشمہ سے نکل کر دریائے مواج کی طرح رواں ہیں اُن میں کدورت کا نام نہیں۔ بالائی سطح پر نظر ڈالو تو تہ کے اندر ڈوبے ہوئے موتی تک اپنی جھلکیاں دکھا رہے ہیں۔ اُن کی شاعری کا معیار فصاحت ہے۔ مضامینِ بلند یا مسائلِ علمیہ ایسے سادہ الفاظ میں مزین و مرتب ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو سوائے سادگی کے کوئی وزن دار خیال محسوس نہیں ہوتا لیکن جو لوگ مذاقِ شاعری رکھتے ہیں اور اُن کا ذہنِ رسا میر انیس کے نظامِ شاعری کی گہری تہ تک پہنچتا ہے، اُن کا ادراک انہیں سادہ الفاظ میں وہ رنگینیاں تلاش کر لیتا ہے جو قدرت کی جانب سے فصلِ بہار کے پھولوں کو عنایت ہوتی ہیں۔ شاعر جہاں تک محاسنِ شاعری کی تحقیق میں سرگرم ہو شعر اپنے میدانِ فصاحت کو وسیع کرتا چلا جاتا ہے۔ ذہن ایک حد تک پہنچ کر تھک جاتا ہے اور شعر کی خوبیوں کی فہرست ناتمام رہ جاتی ہے۔ شاعر بشرطیکہ وہ باخبر شاعر ہو تو اُن کے مصرعوں کی سجاوٹ کو دیکھے جس طرح موتیوں کے ہار کی لڑیاں ایک دوسرے پر اپنی نورانی شعاعوں کا عکس ڈالتی ہیں۔ اسی طرح الفاظ کے گوہرِ نایاب رشتۂ نظم پر ڈھلکے نظر آتے ہیں گویا اک نغمۂ شیریں ہے جس کا اثر کانوں کی راہ سے قلب میں اُتر جاتا ہے یا شربتِ خوشگوار ہے جو دماغ سے قلب تک اپنی تفریح کی تاثیر پہنچاتا ہے۔ فصاحت ایک معقولہ کیفی ہے اور کیفیت کا احساس اُنہیں لوگوں کو خوب

ہوسکتا ہے جن کی باریک بین نظر نزاکتِ زبان کو محسوس کر سکتی ہو۔ میر مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعے سے فلسفۂ قدرت کے جن جن مسائل کی تحلیل کی ہے اُن کا ذکر حسبِ موقع کیا جائے گا اُن کی فکرِ رسا نے کتابِ کائنات کا ترجمہ کرنے میں کیسی کیسی موشگافیاں کی ہیں انشاء اللہ احسن اچھی طرح ثابت کرے گا۔

وہ شاعری کی علتِ غائی کو کماحقہٗ سمجھے ہوئے تھے اُن کی باریک بین نظر کو وہ اشکال محسوس ہوتے تھے جہاں آج فلسفۂ جدید کی عینک لگانے والوں کے خیالات ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ میرے اس نقادانہ خیال کے مخالف بہت لوگ ہوجائیں گے اور خیال فرمائیں گے کہ سیدِ مرحوم کی معلومات دکھانے میں کس قدر مبالغے سے کام لیا گیا ہے، اس لئے میں اپنے اصلی مقصود کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میر انیسؔ فلسفہ میں ابن سینا یا شہاب الدین مقتول و ابنِ طفیل کے مقابل تھے یا اُن کا مرتبہ مجسطی بطلیموس کی اشکالِ ریاضی کا حل ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا علم فلسفۂ ہیئت میں اکتسابی نہ تھا مگر قدرتی ضرور تھا۔ اکتساب کا سلسلہ قائم کرو تو تحقیق کسی حد تک پہنچ کر رُک جائے گی اور ایک کافی دَور و تسلسل کے بعد آخر کوئی شخص واضعِ علم قرار پائے گا فہو المراد اور واضعانِ علوم نے موضوعِ علم کا ہیولا اپنی فطری قوتوں سے قائم کیا ہے پس اسی طرح میر انیسؔ مرحوم کا خیال بھی ایسے ایسے باریک مسائل کی جانب منتقل ہوجاتا ہے جس کو شاید وہ خود بھی نہ جانتے ہوں مگر کوئی فطری طاقت اُن کے ہر ارادے کو پورا کر دیتی ہے۔ قدرتی طور پر اکثر دماغوں میں اس قسم کی استعداد ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کے استدلال پر یہ نظیر کافی ہوگی کہ ہندوستان کی عظیم الشان عمارتیں بنانے والے معمار ریاضی و ہیئت سے ناواقف تھے مگر اُن کی کرنی بسولی نے تمام اشکالِ ریاضی کو حل کر دیا ہے۔ دماغ کا پرکار اور نظر کا کمپاس ہر ایک زاویہ اور عمود کی پیمائش میں کامیاب ہوا۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کا امام باڑہ آگرہ میں تاج محل اور جامع مسجد دہلی کا پیش طاق دیکھ کر آج بڑے بڑے انجینیر دانتوں میں انگلیاں دباتے ہیں تو کیا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ شاہی معمار جن کے متبرک ہاتھوں سے یہ یادگاریں قائم ہوئیں، وہ انجینیری پاس تھے۔ یہ کچھ بھی نہ تھا۔ اُن میں

اکثر تو ایسے تھے جو خط اور دائرے کا فرق بھی نہ سمجھتے تھے مگر دماغ قدرتی طور پر رہنمائی کرتا تھا اور اس علم کو وہ نادانستہ مصرف میں لاتے تھے جس کے لئے آج اصول و قواعد مقرر ہوئے ہیں اور بکار آمد آلات ایجاد کئے گئے ہیں۔ کیا ہرج ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ رائے قائم کرلی جائے کہ میر مرحوم کو بھی قدرت کی جانب سے ایسا ہی دماغ عنایت ہوا تھا جو ہر مشکل کو آسان کردیتا تھا اور خود بخود علوم مختلفہ کے ابواب اُن پر روشن تھے تاہم اُن کی معلومات بھی ناقص نہ تھی جس کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں لیکن اُن کی سادہ نظموں سے اُن کے علم و تحقیق کی حد دریافت کرنا عالی دماغ لوگوں کا کام ہے جو غیر مادی اور غیر محسوساتی تصویروں کا مشاہدہ کرسکتے ہیں وہ انیسؔ مرحوم کی شاعری کو پرکھ لیں گے ؎

ما ہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجو

سایہ ہمچو دود بالا می رود از بال ما

شاہینِ بلند پروازِ فکر کے بازوؤں میں کیا خداداد طاقت تھی کہ فضائے عالمِ خیال کی سیر سے کبھی تھکن پیدا نہ ہوئی۔ وہ زمین و آسمان پر یکساں نظر ڈالتے تھے۔ جس طرح اجرامِ فلکی اُن کی سیرگاہ تھے اُسی طرح کرۂ ارض کے معدنیات و نباتات و جمادات پر بھی عبور تھا۔ جادو نگار مصنّف کے قلم نے گلزارِ کائنات کے گل بوٹوں پر ایسی غائر نظر ڈالی اور نیچر کے صنائع متنوعہ کی تصویروں میں وہ شاعرانہ رنگ بھرا جس سے پتّے پتّے کی ماہیّت کا راز کھُل گیا۔

دُنیا کے سیاحوں کے قلم مجبور ہیں اور زبانیں قاصر۔ وہ اپنے مشاہدات کی تصویر کھینچنے کے لئے کافی الفاظ نہیں پاتے جو اُن کے دِلی جذبات کا اظہار کرسکیں مگر میر انیسؔ نے خیالی مناظر کی تشریح کو مشاہدات پر فوق دے دیا یا یوں کہو کہ اُس فطری طاقت نے خیال کو مرکزِ اصلی کی جانب پہنچا دیا۔ کوئی تیر اُن کے ترکش سے ایسا نہ نکلا جو اپنے نشانے پر پُورا نہ بیٹھا ہو۔

اصنافِ سخن میں قصیدہ گوئی ایک ایسا وسیع دائرہ ہے جہاں شاعر کا اشہبِ خیال بے روک ٹوک طرارے بھرتا ہے اور تشبیب کی خود مختاری تمام قیود سے آزاد رکھتی ہے۔ ہر

شعرا اپنے رنگ میں جُدا جُدا مظاہر کا نمونہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے ربط و ردف کا محتاج نہیں۔ کوئی عاشقانہ رنگ میں ہے تو کوئی فلسفیانہ خیال میں۔ کوئی علمِ ہیئت کا محور بنا ہوا ہے تو کوئی تصوف کا مرکز۔ گوناگوں اور رنگارنگ جلوہ آرائیاں اپنی شان دکھاتی ہیں۔ مختلف علوم و فنون کے پھولوں سے یہ گلدستہ تیار کیا جاتا ہے۔ براعتِ استہلال سے مصنف کا کوئی ارادہ ثابت ہو کہ نہ ہو مگر تشبیب کی خودمختاری صنعتِ مبالغہ کے پر لگائے ہوئے اُڑائے لئے پھرتی ہے۔ یہ حیرت انگیز امر ہے کہ انیس مرحوم نے مرثیوں میں ان لوازم کا خیال رکھا ہے اور مرثیہ کا مقدمہ جس کو اصطلاحِ مرثیہ گوئی میں چہرہ کہتے ہیں، ایسی رنگین خیالیوں سے مرتب کیا کہ اُس کی تشبیب کے سامنے عرفیؔ اور قاآنی کے قصائد کا رنگ پھیکا پڑ گیا اس کے بعد اپنے ہیرو کا کیرکٹر دکھانے میں میر انیس نے شیکسپیر کی معجز نگاری کو بھلا دیا۔ جذباتِ اصلی اور خصائلِ انسانی رنج۔ خوشی۔ تعجب۔ نفرت۔ شجاعت سخاوت۔ شوق و ولولہ۔ اخلاق۔ ہمدردی۔ محبت۔ مروت۔ عداوت۔ غیظ و غضب۔ ضبط و تحمل صبر و استقلال۔ امید و بیم کے جذبات دکھانے میں تشبیہہ و استعارات کے ساتھ ساتھ شاعری کے اصلی عنصر یعنی فصاحت کا پورا خیال رکھا ہے اور باوجود ترکیبِ عناصرِ شاعری شعر کا جسم پانی کی طرح لطیف نظر آتا ہے[1]۔ جس طرح بڑے بڑے بوٹانیسٹ آج تک عناصرِ نباتات کے دریافت کرنے میں مصروف ہیں اُسی طرح شعرائے محقق اُن کے عناصرِ شاعری کی تحقیقات میں مشغول ہیں اس لئے اُن کی شاعری نے بہت مدت کے بعد اپنے عارضِ روشن سے نقاب ہٹائی ہے۔ اُن کی زندگی میں اُن کی مقبولیت ایک شاعرِ نازک خیال کی حیثیت سے ہوئی مگر اُن کے بعد تو ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ شاعرِ مذہبی و حقیقی تھے اور آج اُنکی زبان کا فلسفہ اُردو شاعری کا مقیاس بن گیا۔ مشرق سے مغرب تک مان لیا گیا ہے کہ نیچرل فلاسفی کے پروفیسر میر انیس ہی تھے اور وہ آنے والی صدیوں

---

[1] حکما کا قول ہے کہ پانی بسیط نہیں مرکب ہے۔ آکسیجن اور ہائڈروجن دو ہواؤں سے مل کر بنا ہے اگر نشترِ کیمیاوی سے پانی کو پھاڑیں تو مذکور الصدر دو ہوائیں پیدا ہوں گی اور صورتِ سیال فنا ہو جائے گی۔

تک کے لیے مذاقِ شاعری کا ایسا مسالا جمع کر گئے ہیں جس کی ترمیم میں مصلحانِ زبان قاصر ہیں۔ ہر طرزِ زبان جو حسبِ مقتضائے مذاقِ زمانہ دس بیس برس کے بعد منسوخ ہو جاتا ہے اور باعتبارِ دستور العملِ فصحائے وقتِ موجودہ شعرا اُس قانونِ مجریۂ زبان کو تقویمِ پارینہ کی طرح خارج کر دیتے ہیں۔ اس تعزیراتِ ہند کی دفعات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتے۔ اس مستحکم بنیادِ شاعری کے آثار ایسے زبردست ہیں جن کو انقلابِ زمانہ کی طوفانی موجیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں کیوں کہ اس رنگِ شاعری کے موجد و واضع نے پہلے ہی سے بقائے دوام کا لحاظ رکھا ہے اُن کی آواز دُنیا میں سو برس بعد آنے والوں کو سنائی دی ہے۔ وہ ایک زبردست طبیعت کے مالک تھے اور اُن کے زورِ طبیعت و استقلالِ مزاج کی بیّن دلیل یہ ہے کہ ہر زمانے کے شعرا مذاقِ مروجۂ شاعری کے پابند ہوتے ہیں اور حسبِ رفتارِ زمانہ اپنی طبیعت کو مذاقِ مقبول سے وابستہ کرتے ہیں۔ جس طرز کو زمانہ پسند کرتا ہے شعرائے وقت اُس کی تقلید میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں اور یہ بات موجبِ شہرت ہے۔ کچھ تو یہ میلان انسانی طبیعتوں کا خاصہ ہے اور کچھ مقتضائے وقت مگر میر انیس کی طبیعت تقلیدِ غیر سے نفور ہے۔ گو اس کا اثر اتنا ضرور ہے کہ بسببِ مباینت طبائع اُن کے جوہرِ شاعری کے پرکھنے میں قدر دانوں کو اوّل اوّل غلط فہمی ہوئی کیوں کہ وہ اربابِ نظر کی نگاہوں سے بہت دُور تھے۔ پچاس برس کے عرصے میں وہ فاصلہ طے ہوا ہے اور اس الہامی شاعری نے دُنیا کے ہر حصے میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ میر انیس کی شاعری نے جب لکھنؤ میں نشو و نما کیا تو اُس وقت ناسخ مرحوم کی شاعری کا آفتاب نصف النہارِ ترقی پر تھا۔ مرزا دبیر مرحوم مضامین آفرینیوں میں اُس امامِ وقت کی تقلید کر رہے تھے۔ اندازِ مقبول سے طبیعتیں مانوس ہو رہی تھیں اور زمانے کی نظریں اس رنگ پر ٹوٹی پڑتی تھیں ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اُس وقت میر انیس اپنی شاعری کی تخم ریزی میں مصروف تھے۔ زمانہ اُن کو اپنی جانب

کھینچتا تھا اور وہ خاموشس اپنا کام کر رہے تھے آخر کار اُن کا زورِ طبیعت لاکھوں آدمیوں کی قوّت پر غالب آیا اور طلوع ہونے والے آفتابِ شاعری کی شعاعیں خطِ استوا پر پہنچ کر غریبوں کے جھونپڑے اور بادشاہوں کے عالیشان محلوں پر یکساں نور افشانی کرنے لگیں۔ میرے مخدومِ مکرم خان بہادر میر علی محمد صاحب شادؔ نے اپنی تصنیف "نوائے وطن" میں ایک موقع پر میر انیسؔ کے حالات کے متعلق اپنا کچھ خیال ظاہر کیا ہے جو میرے خیال سے مطابق ہے اس لئے کتاب "نوائے وطن" سے اُس کا اقتباس کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں[1] جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ بہر کیف میر انیسؔ کا خیال اپنے مرکزِ شاعری سے بال برابر آگے پیچھے نہیں ہٹا ہے اور بڑے

---

[1] اب ہماری شاعری کچھ اور رنگ بدلتی ہے اور وہ پھول پھولتا ہے۔ باغِ عالم میں جس کی سدا بہار رہے گی۔ اس چمن میں اب وہ بلبل نغمہ سرا ہوتا ہے جس کے آگے گل اگلی صدائیں دب کے اور پھیکی پڑ کے محض ایک افسانہ یا ترانہ رہ جائیں گی۔ اب وہ وقت آتا ہے کہ اُردو زمین آسمان پر چمک زن اور ہندوستان کی شاعری قدرتی کیفیات سے یورپ کے پہلو بہ پہلو مانی جائے گی۔ فیاضِ مطلق کے دریائے فصاحت میں سے ایک ایسا دُرِ بے بہا نکلا جس کی زرق و شرق سے ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں سے لے کر بے آف بنگال تک دفعتاً یکساں جگمگا اُٹھا۔ وہ کون میر انیسؔ۔ میر صاحب قدرتی شاعر اور فطری مضمون نگار تھے اگرچہ اُنہوں نے عشق و عاشقی، گل و بلبل، وصل و ہجر، بہار و خزاں، وفا و جفا کے پامال و مندرس مضامین کی طرف نہ عام شعرا کی طرح کبھی رُخ و توجہ کی اور نہ کبھی اُس کے پابند رہے لیکن اپنے ایک ہی صنف میں ان مختلف مضامین کو بھی اپنے رنگِ بیان میں مناسبِ حال موقعوں پر تمام اگلے استادوں سے دو چند عمدگی اور صفائی کے ساتھ کہہ کر اور برت کر دکھا گئے اور نئے نئے فطری مضامین کے ساتھ ساتھ پرانی روشنی میں بھی اُن باریکیوں اور نازک خیالیوں کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جن کے بغیر ایشیائی شاعری یہاں کی عام نظروں میں معراجِ کمال پر پہنچی ہوئی سمجھی جاتی تھی۔ ایک ہزار مرثیوں سے زیادہ نظم کئے اور اسی قدر یا اس سے کچھ کم سلام و رباعیات۔ پھر مرثیہ بھی زیادہ تر دو دو سو اکثر تین تین سو بند کے۔ ہر مرثیہ بلکہ ہر بند میں ایک

(باقی دیکھو صفحہ آئندہ)

استقلال سے اپنے کام کو پُورا کیا ہے وہ یقینی طے کر چکے تھے کہ میرے گلزارِ شاعری کے
رنگا رنگ پھولوں سے ایک روز تعلیم یافتہ انجمنوں کے لئے گلدستے بنائے جائیں گے مگر
دُنیا کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اِس سرچشمۂ زبان سے آبِ حیات کی لہریں نکل کر ہندوستان کی

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ) لفظ کے مناسب دوسرا لفظ اس افراط و بہتات سے لے آئے جس کی تعریف محال اور
جسے دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے۔ کہہ سکتا ہوں کہ قریب ایک لاکھ لفظوں کے جواہر اس خوبصورتی اور
بے تکلفی سے چُن کر بہ سلیقہ و ترتیب جمع کر دیئے تھے کہ اب جو چاہے اپنا دامنِ فکر بے کھٹکے بھر لے۔ اگرچہ
فیاضِ مطلق کا خزانۂ فیض بند نہیں رہتا اور نہ قانونِ قدرت میں کوئی ایسی دفعہ ہے جو مانعِ ترقی ہو۔ اس لئے
ممکن ہے کہ اب بھی لندن میں شیکسپیئر کا سا عالی دماغ عجم میں فردوسی سا بلند خیال اور یونان میں سکندر سا
اولوالعزم بادشاہ پیدا ہو جائے لیکن اوّلیت کے ساتھ رفعت کا تاج جیسا ان کے مبارک سروں پر ٹھیک
آگیا ویسا اب دوسرے سروں پر درست بیٹھنا مشکل ہے۔ زمانہ جس حال پر چلتا ہے اس کی اطاعت سے
اہلِ زمانہ منہ نہیں موڑتے۔ وہ ایک پُرزور گھوڑا ہے جس کی باگ ایک سے زیادہ آدمیوں کی قوت سے بھی
نہیں مُڑ سکتی۔ مگر کوئی نہ کوئی اپنے وقت کا رستم و اسفندیار نکل ہی آتا ہے اور پیدا ہو ہی جاتا ہے جو سب
سے الگ ہو کر اپنے ایجاد و اختراع کی کمند میں زمانے کی گردن پھانس کر اپنی طرف اِس زور سے گھسیٹ
لیتا ہے کہ آخر زمانہ اُس کے آگے سر ڈال دیتا ہے بعینہٖ یہی حالت میر انیس اور اُن کی قوت بھری زبان اور اُن کی
پُرزور شاعری کی ہے۔ انیس مرحوم کی شاعری میں ایسا ایجاد و اختراع تو نہیں ہے جسے بالکل ایک نئی قسم کی
نظم کہہ دوں لیکن خیالات و مضامین کے ساتھ بندش سلاست معنی لطافت و مناسبت الفاظ کے ایک
ہی جا جمع کر دینے سے بلاشک موجدی اور اولیت کا تمغا زبان دانوں کی مجلس سے ملنے کے وہ مستحق و سزاوار ہیں قدرتی
کیفیات اور واردات وحسیات کا بیان کرنے والا ہندوستان میں کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا تھا جس کا نام ہم شعرائے یورپ
کے ساتھ بے تکلف لے دیتے اس لئے کہ ایشیائی شاعری ایشیا والوں کو ہمیشہ کچھ ایسی مرغوبِ دل رہی کہ اُس
انداز کو چھوڑ کر نئے پیرایہ میں اظہارِ خیالات یا تو اُن لوگوں کے پسندِ خاطر ہی نہ تھا یا اُسے جانتے ہی (دیکھو صفحۂ آئندہ)

کی مُردہ شاعری میں جان ڈالیں گی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ فصحائے وقت کی میزوں پر میر انیس کا کلام تبرکاً موجود ہے اور مغربی کتب خانوں میں بھی یہ ذخیرہ مقبولیت کے فرشتوں نے جمع کر دیا تمام دُنیا کے اہلِ قلم نے بقدرِ حوصلہ میر انیس کی شاعری پر تنقید لکھی ہے جن کی تفصیل اہلِ نظر کی

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) نہ تھے لیکن پھر بھی عشق و عاشقی کے رنگ میں اُمنگ و جوش بھرے بعض بعض سچے شعر میر تقی میر مرحوم کے اور اس کے بعد حقیقت کا افشائے راز کرنے والے اکثر فطرتی اشعار انیس کے اگر پڑھے جائیں تو اردو کا بنیا کالا اور انگریزی سے واقف کار شاید شیکسپیئر سے پیچھے ان دونوں بزرگوں کو نہیں رہنے دے گا۔ میر صاحب کا جو مرثیہ ہے وہ ایک نرالے ہی انداز کا ہے اور جو بند ہے وہ ایک عجیب ہی روپ رکھتا ہے۔ غم والم کا بیان ہے تو ایسا ہی جگر خراش اور فرحت و شادی کے مضامین ہیں تو ایسے ہی انبساط و فرحت خیز صبح کی کیفیت رات کا سناٹا اور اُداسی۔ لڑائیوں کا کھیت۔ تیغ کی کاٹ۔ دریا کا گھاٹ۔ صفوں کی صفائی فوجوں کی دُہائی۔ لشکر کی کھلبلی ہراساں دھنی بلی میدانیوں کا جوش و خروش، دشمن باختہ ہوش سُخنور بزن بکوش گھوڑے کی جست و خیز اعدا کی گریز گریز غرض جو کچھ جہاں پر کہہ دیا ہے گویا ایک سچی تصویر کھینچ دی ہے اور حقیقت کا مرقع بنا کر سامنے لا کھڑا کر دیا ہے۔

میر انیسؔ مرحوم عربی اور فارسی زبان و علوم میں اچھی طرح ماہر تھے۔ اردو شاعری کے سب فنون میں طاق و مشاق تھے۔ اُستادوں کے کلام اُنہیں اس قدر یاد تھے کہ ایک مثال کے لئے کئی کئی شعر پڑھ دیتے تھے۔ یہ جو لوگ اعتراض کر دیتے ہیں کہ میر صاحب نے واقعاتِ کربلا کی ضعیف ضعیف روایتوں کو بھی نظم کر دیا اور اس سے اُن کا نقص سمجھا جاتا ہے۔ ہم اس کو قبول کریں یا رد دونوں طرح ایک مذہبی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اس لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان ضعیف روایتوں کے نظم کرنے سے اُنکی اس قدرتی اور فطری شاعری میں نہ کوئی نقص آتا ہے اور نہ دھبہ لگتا ہے جس کی تعریف ہم کر رہے ہیں۔

میر صاحب نے قریب پچھتر برس کی عمر پاکر ۱۲۹۱ھ میں ۳۰ شوال کو لکھنؤ میں رحلت فرمائی اور وہیں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس مضمون کے ساتھ میرے معزز دوست نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال نے بذریعہ نوازش نامہ جو اپنی رائے ظاہر فرمائی ہے وہ بھی قابلِ تحریر ہے۔

(باقی دیکھو صفحہ آئندہ)

نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے مگر باوجود مبائنت مذاقِ زبان انسائیکلوپیڈیا کے فاضل مصنف
کی روشن رائے قابلِ قدر ہے۔ دیکھو انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۱ صفحہ ۸۴۸ حرف ڈی۔

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) یہ کتاب نوائے وطن اس وقت کی تصنیف ہے جب کہ عموماً ہندوستان اور خصوصاً صوبۂ بہار
میں میر انیس ایک فطری شاعر کی حیثیت سے نہیں مانے جاتے تھے بلکہ ایک ذاکر کا لقب یا زیادہ سے زیادہ صرف اپنی زبان میں
اپنے خیالات نظم کرنے والے شاعر کے خطاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ عام طور پر میر صاحب کی مخالفت ہوتی تھی اور
ایراد و اعتراض کرنا شمعِ محفل سمجھا جاتا ہے۔ خود خان بہادر شاد اپنا کلام اکثر مرزا دبیر کو دکھاتے تھے اور اُن کی شاگردی
کو اپنا طرۂ دستار سمجھا کرتے تھے۔ میر انیس کا اُس وقت تعریف کرنا اپنا مضحکہ اڑانا اور اپنے ساتھ مخالفت کا پھیلانا تھا
وفتہ زمانے کا ورق الٹا دوسری ہوا چلی اور صوبۂ بہار کے شعرا اور وہاں کی زبان وغیرہ کے حالات لکھنے کی جناب شاد
کو ضرورت محسوس ہوئی۔ چونکہ دل و دماغ دوسرا لائے تھے باوجودیکہ مرزا صاحب سے شاگردی و استادی کے رشتہ
کے علاوہ جو ہمیشہ سے خاندانی مراسم بھی جاری تھے۔ اس پر بھی چھپے طور پر ہمیشہ سے میر انیس کے مداح رہے اور آخر
میں جب کتاب لکھنے بیٹھے تو ضرور تاً میر صاحب کے کلام پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہوئی۔ کلام کو باستیعاب دیکھنے
کے بعد اُن کی نظروں میں پھر کوئی اگلا پچھلا شاعر نہ جچا اور آخر آخر اپنے خیالات ان چند سطروں میں ادا کر دیے جو نقل
کئے گئے ہیں۔ زمانہ کی زبان اور رنگ کے خوف سے جتنا بھر اُن کا دل اس وقت یہی چاہتا تھا کہہ نہ سکے جس کا اب اس
عمر میں افسوس کرتے رہتے۔ اس کتاب کے نکلتے ہی صوبۂ بہار میں ایک شورشِ عام پھیل گئی اور ہر طرف مخالفت
کی جھنڈیاں اُڑنے لگیں۔ میر انیس کی مداحی اس وقت میں ایک جرمِ خاص تھا جس کی سزا ہجو آمیز لفظوں میں دینا شعار سمجھا
جاتا تھا۔ اس کتاب میں چونکہ عظیم آباد کی اصلی اور پرانی زبان کے مٹ جانے پر افسوس ظاہر کر کے اس کا سبب شہر
میں بعض اہلِ دیہات کا رسوخ اور اُن کے خاندان کا عروج تسلیم کیا گیا ہے اور یہ بات دکھائی گئی ہے کہ شہر کے نجبا و شرفا
سے یہاں کے گلی کوچے خالی ہو گئے جن کی جگہیں باہر والوں اور اہلِ دیہات نے لے لیں اس وجہ سے شہر کی عام
زبان خراب ہو گئی۔ اہلِ دیہات جو اس وقت سربرآوردہ اور اہلِ شہر پر غالب ہو چکے تھے۔ اس کتاب کے نکلتے
ہی بے حد رنجیدہ ہوئے اور اپنا دلی بخار نکالنے کی غرض سے الپنچ اخبار میں شائع کر کے (باقی دیکھو صفحہ آئندہ)

متقدمین بلکہ میر انیس کے بزرگوں کے مرثیے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ گوئی اس وقت تک ایک محدود فن تھا اور اسی بنیاد پر بگڑا شاعر مرثیہ گو کہلاتا تھا۔ سید انشاء اللہ خان

(بقیہ از صفحۂ گذشتہ) شاد پر ایراد و اعتراض کی بوچھاریں شروع کیں۔ اہلِ شہر جو معدودے چند تھے تھوڑے دنوں تک ان کا ساتھ دیتے رہے، مگر جب انہیں بھی یہ امر دکھایا گیا کہ یہ شخص سوا اپنے اور اپنے خانوادہ کی زبان کے صوبہ بہار میں کسی ایک کی زبان کو تسلیم نہیں کرتا اور علاوہ اس کے مرزا صاحب کا شاگرد ہو کر میر انیس کا مداح ہے اور مرزا صاحب سے اب بیزار نظر آتا ہے تو عموماً اہلِ شہر بھی جن کے نزدیک مرزا صاحب سے بہتر کوئی دنیا میں شاعر نہ تھا اور میر صاحب جن کی نظروں میں ایک معمولی شاعر سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتے تھے سخت بیزار ہو کر اہلِ دیہات کے شریک ہو گئے اور پھر کامل بارہ برس تک یہ طوفانِ بے تمیزی برپا رہا جس کے آثار ہنوز باقی ہیں۔ کارواں جا چکا مگر غبار اب بھی نظر آجاتا ہے۔ اور اہلِ دیہات میں سے کوئی نہ کوئی اب بھی اللہ کا بندہ برس چھ مہینے پر چونک پڑتا ہے اور اس سنت کو جگا ہی دیتا ہے۔ لیکن کیا انقلابِ زمانہ ہے کہ جس شہر میں میر انیس کا نام لینا ایک گناہِ کبیرہ خیال کیا جاتا تھا اور جس کا کلام جنابِ شاد پر لعنت ملامت کرنا سمجھا جاتا تھا وہی شہر اب ہے کہ بعض بعض بیرونی خاندانوں اور گھروں کے سوا پورب دروازے سے پچھم دروازے تک سیدھے چلے جاؤ تو میر انیس کے سوا کسی دوسرے کا نام نہ سنو گے۔ مجلسوں میں سوا انیس کے کلام کے اگر دوسرے صاحب کا مرثیہ پڑھا جائے تو رنگِ مجلس دگرگوں ہو جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انیس کا کلام سمجھنے کی قابلیت سب سے پہلے شاد ہی میں پیدا ہوئی اور ان کے نکاتِ شاعری کو دوسرے اہلِ وطن پر واضح و لائح کرنے میں جنابِ شاد نے بہت غم و غصہ اپنے سر لیا۔ بڑے بڑوں کو سر کیا۔ اپنی غزلوں میں بھی ابتدائی وہی رنگ شروع کیا جو میر انیس مرحوم کے سلام و رباعیات میں جھلک رہا تھا اور آخر بارہ برس سے خود مرثیہ گوئی پر کمر ہمت چست باندھی اور اسی روش کو اختیار کیا جو میر انیس مرحوم کے خاندان کی ہے۔ خدام ظلہ العالی۔

اپنی تصنیف دریائے لطافت میں ذکر کرتے ہیں کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو کہلاتا ہے اور اس فن کو لوگ کم نظری سے دیکھتے ہیں۔ سکندر۔ گدا۔ مسکین۔ افسردہ اُس وقت کے مرثیہ گو ہیں جن کی طبیعت کی مسکینی اور افسردگی تخلصوں سے ظاہر ہو رہی ہے کیا عجب ہے کہ اسی خیال سے ناسخ مرحوم نے میر انیس مغفور کے تخلص پر اعتراض کیا ہو جو اُس وقت حزیں تھا باوجودیکہ مرثیے کے لئے مناسبت رکھتا ہے مگر ان مرزکی نفس بڈھوں کے کانوں میں فرشتۂ غیب کی آوازیں آتی تھیں۔ اُن کو خبر ہوگئی کہ اس مبارک عطیہ کو قبولِ عام کا سرٹیفکیٹ ملے گا اور ایسا ہی ہوا۔ بہرکیف اگلے بزرگوں کو مرثیہ گوئی سے محض حصولِ ثواب منظور تھا۔ بنی نوعِ شعرا کے آدم میاں ولی نے واقعاتِ شہادتِ امام حسینؑ کو ایک مثنوی کے طور پر نظم کیا ہے اور اُن کے ہم عصر میاں فضلی نے دہ مجلس لکھی اور شاہ حاتم نے بھی مناقب و مراثی میں اپنی شاعری کا رنگ دکھایا۔ مرزا رفیع سودا کے کلیات میں بھی چند مرثیے ہیں مگر اُسی اندازِ مروجہ کے موافق ہیں۔ باوجودیکہ اُن کی خلاق طبیعت تشبیہ و استعارات کا چمن کہلاتی ہے مگر صنفِ مرثیہ میں وہ بھی کورے نظر آتے ہیں۔ اساتذۂ قدیم کے مرثیوں کی بنیاد چار مصرعوں پر ہے۔ ہر چوتھے مصرعہ میں تکرارِ قافیہ واقع ہے۔ مضامین کے لحاظ سے واقعاتِ کربلا کو خون کے آنسوؤں سے لکھا ہے۔ اب اُس خلاقِ معانی کے اعجازِ شاعری پر نظر ڈالو جس نے مرثیہ کے قالب میں جدت کی نئی روح پھونکی اور اُس کو رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ بنادیا۔ لہٰذا اس فن کی جدت کا سہرا میر انیس ہی کے سر رہا ہے۔ اُن کے والدِ مرحوم نے ایک بنیاد ڈالی اور فرزندِ رشید نے اُس بنیاد پر ایک خوشنما عظیم الشان عمارت تیار کردی۔ مرثیہ کو مسدس کے طور پر چھ مصرعوں پر رواج دینے سے کئی باریک باتوں کی جانب ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ چار مصرعوں کے مضامینِ مختلفہ کی تشریح و تصریح کا لطف پانچویں اور چھٹے مصرعہ کی خوبیوں سے وابستہ ہے جس کو اصطلاحِ مرثیہ گوئی میں بیت یا ٹیپ کہتے ہیں اور ایک طولانی مضمون کی شرح و بسط کو چھ مصرعوں کا میدان مناسب سمجھا گیا ہے۔ بیت کا لگاؤ اس خاندان میں اکثر چوتھے مصرعہ سے پایا جاتا اور اس قاعدے کے موجد و مخترع میر انیس

ہیں، چوتھے مصرعہ کی خوبی پانچویں اور چھٹے مصرعہ میں شاعر کی ترقیِ خیال کا مرکز ہے، چار مصرعہ متحد القوافی واقع ہونے کے بعد بیت کے دو مصرعہ مختلف القوافی اندازِ خوانندگی کو قوت دیتے ہیں مرثیہ گوئی میں بیت ایک آخری منزل ہے جس طرح مسافر کو آخری منزل پر پہنچ کر سکون ہوتا ہے اسی طرح شاعر اس آخری منزل پر پہنچ کر آرام لیتا ہے۔ بیت کی خوبی کی وجہ سے پھر ساتواں مصرعہ یعنی دوسرے بند کا پہلا مصرعہ ایک کافی قوتِ شاعری چاہتا ہے اور اسی طرح بتدریج نظم کی شان ترقی پذیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ احاطہ کیا ہے جس کی نسبت میرانیس مرحوم اپنے ایک مرثیہ میں اشارہ فرماتے ہیں سہ

ہو اگر ذہن میں جودت ہے کہ موزونی ہے

اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ فصاحتِ زبان کی حد بندی ہے اور یہ حیرت انگیز بات ہے کہ مشکل سے مشکل خیالِ شاعری کو وہ اپنے طرزِ نظم کے سادہ لفظوں میں اس طرح موزوں فرماتے ہیں کہ بادی النظر میں مضمون کی پیچیدگی اور اہمیت فصاحت کے گھونگھٹ میں منہ چھپا لیتی ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ایسے مہتم بالشان خیال کے لئے ایسے سادہ لفظ کہاں سے تلاش کئے گئے ہیں۔ سہل الممتنع اسی کا نام ہے۔ اساتذۂ متقدمین نے گراں وزن مضامین کو قالبِ نظم میں ڈھالتے ہوئے معائب ونقائصِ شاعری کا چنداں لحاظ نہیں رکھا ہے بلکہ بعض موقعوں پر ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن کر لیا ہے۔ اغلاق وتعقید سے شعر کے حسنِ ظاہری کو مٹا کر بھدا کر دیا ہے جس سے نزاکتِ زبان ولطافت وسلاستِ شاعری کا جوہرِ لطیف فنا ہو گیا۔ اگر میں ایسی مثالیں اساتذہ کے کلام سے اقتباس کروں تو در پردہ اُن بزرگوں پر اعتراض عاید ہوتا ہے اور نامہ سیاہ احسن اپنی اس ناچیز تالیف کے وقت اعتراض کے خس وخاشاک سے دامن بچاتا ہوا جاتا ہے چونکہ حقیقتِ امر کا کتمان میرے فرائض کے خلاف ہے اس لئے اُن کی شاعری پر امتیازی نظر ڈالتے ہوئے یہ راز کھولنا پڑتا ہے مگر اس بارے میں میں خاموش ہوں۔ نقادِ طبیعتیں خود اندازہ

کرلیں گی اور تقابل کا لطف اٹھالیں گی۔ میر انیس کی نظم میں ایہام نہیں، مقدرات نہیں معنی بند نہیں صرف فصاحتِ زبان کے جوہرِ اصلی کی درخشندگی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ انیس مرحوم کی شاعری کو کم و بیش سو برس کا زمانہ گزرتا ہے اور اُن کا ابتدائی کلام مصحفی، انشاء اور جراُت وغیرہ سے بہت قریب ہے مگر صفائیِ زبان اور درستیِ محاورہ میں ابتدا کو انتہا سے کچھ بھی مغائرت نہیں معلوم ہوتی سوائے اس کے کہ بلند خیالی اور مضمون آفرینی کثرتِ مشق سے بڑھتی گئی ہے اور کلامِ آخر کو اوّل پر فوق ہے تو اسی قدر ہے ورنہ روانیِ طبیعت فصاحتِ زبان و روزمرہ شائستگیِ محاورات میں کوئی انقلاب و تغیر محسوس نہیں ہوتا اور یہ بات شعرا کے کلام میں کم پائی جاتی ہے۔ ایامِ شباب کی تصنیف کو زمانۂ انحطاط و شیخوخت سے فاصلۂ بعید واقع ہونے کی وجہ سے تغیرِ زبان و تبدیلیِ محاورات کا اثر کلام میں مابہ الامتیاز فرق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تغیر امتدادِ زمانہ کی وجہ سے واقع ہوتا ہے مگر خدا کی شان ہے کہ میر انیس کا کلام اس تغیر سے معرا و مبرا نظر آتا ہے۔ اربابِ بصیرت نے بہت کوشش کی اور زمانۂ حال کے نکتہ چین جرم مُردوں کو زیادہ تختۂ مشق بنانے کی فکر میں رہتے ہیں (کیوں کہ وہ بے چارے لبِ گور سے کسی واجبی یا غیر واجبی سوال کا جواب نہیں دے سکتے) اس تحقیقات سے غافل نہیں مگر ایک ہزار مرثیوں کی تعداد میں ایک جگہ بھی نقطۂ انتخاب لگانے سے قاصر ہیں۔ یہ انتہائے فصاحتِ زبان کا ثبوت ہے اور خدائے سخن میر تقی میر کے کلام کی مقبولیت بھی اسی ایک صفت سے عالمگیر ہے کہ اُن کا اکثر کلام باوجود امتدادِ زمانہ اس وقت کے فصحا کی زبان کا مقابلہ کرتا ہے۔ ہر چند ایسے اعتراض جن میں زمانہ اور سوسائٹی کا لحاظ رکھا جائے فقیر احسن کے نزدیک کم وقعت ہیں کیوں کہ بے دردنا انصاف معترض کو خیال کرنا چاہیے کہ آج جن کی زبان حسنِ گویائی سے محروم اور جن کے کان قوتِ سماعت سے مجبور ہیں یا جن کو خوابِ مرگ کی گہری نیند نے ہمیشہ کے لئے دُنیا اور اہلِ دُنیا سے بیگانہ بنا دیا وہ کبھی زندہ دلوں کی انجمن کے صدر نشین تھے۔ اس خیال نے میرے زخمی دل پر نشتر لگا کے مجھے ایک گذرا ہوا وقت یاد دلا

دیا جس کا ذکر اس موقع پر بوجوہ چند نہایت ضروری ہے۔

شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی نے اپنے مقدمۂ دیوان میں شاعری پر ایک بسیط مضمون لکھا ہے اور اقسام شاعری کے لوازم سے جو بحث کی ہے اُس رُو میں ہزاروں اعتراض شعرائے متقدمین پر عاید ہو گئے ہیں۔

اصنافِ شاعری میں صنفِ مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے میرے نانا حکیم نواب مرزا شوق مرحوم کی مثنویوں پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے۔ یوں تو بے چارے قلقؔ اور نسیمؔ وغیرہ سب اس وبا میں مبتلا ہو گئے ہیں مگر ایک تعجب خیز اعتراض حکیم صاحب مرحوم کی مثنویوں پر ہے جس کی بنیاد (انمارل) ہونے پر قائم کی گئی ہے اور اس اعتراض کا تعلق مثنوی لذتِ عشق سے ہے مجھے خواجہ صاحب کی اس دلیری پر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ لذتِ عشق مثنوی جو مرزا آغا حسن نظم کی تصنیف ہے اور آخر میں مصنف کا تخلص بھی موجود ہے اس کا انتساب حکیم صاحب سے کر کے بے موقع اعتراض سے اپنی تحقیق پر کیوں الزام لگایا ہے۔ یہ چاروں مثنویاں ایک ہی زمانے میں تصنیف ہوئیں۔ ایک ہی مطبع میں چھپیں اور اکثر ایک ہی جلد میں شیرازہ بندی ہوئی اس لئے عوام اس غلطی میں پڑے مگر مولوی صاحب کی تحقیق کا یہ مقتضا نہ تھا کہ وہ آنکھیں بند کر لیں۔ شاہنامہ کو نظامی گنجوی اور سکندر نامہ کو فردوسی طوسی کی تصنیف بتا کر مرنے والوں کی رُوح کو بے چین کریں۔ چونکہ مولوی صاحب کے دیوان کا مقدمہ پڑھنے والے ہمیشہ کے لئے اس دھوکے میں پڑے رہیں گے اس لئے ایک مختصر سا جواب اس تصنیف کے ذریعے سے شائع کر دینا میرا فرض ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر زمانے کی شاعری سوسائٹی کی محتاج ہے اور قدرتی طور پر شعراء کی طبیعتیں اندازِ مقبول کی جانب رجوع ہوتی ہیں۔ دیکھو زمانۂ موجود میں شاعری نے قومی ہمدردی کے قالب میں جنم لیا ہے۔ جب قوم ادبار و افلاس میں مبتلا نہ تھی اُس وقت کوئی شاعر قوم کا رونے والا بھی نہ تھا۔ نہ یتیموں کے رونے کی آواز کسی کے کان میں جاتی تھی نہ کسی بیوہ کی مناجات

مناجات دل ہلاتی تھی کیوں کہ دونوں کے زخموں پر مرہم ایثار و کرم کے پھاہے لگانے والے موجود تھے۔ دُنیا کا عیش و آرام موافقتِ زمانہ سے وابستہ ہے۔ ہم اپنے ناظرین کو تھوڑی دیر کے لئے ۱۸۵۲ء کا لکھنؤ دکھاتے ہیں اور اُس دربارِ شاہی میں پہنچائے دیتے ہیں جہاں جنابِ شوق بادشاہِ اودھ کے تخت کا پایہ تھامے ہوئے جھوم جھوم کر اپنی مثنوی پڑھ رہے ہیں اور اُردوئے معلّٰی کی جادو بھری نظم نے اہلِ دربار کو بے خود و مست بنا دیا ہے فی الحقیقت اس کلام کا لُطف وہ نہیں اُٹھا سکتے جو زبان کی خوبی اور محاورات کی خوش اسلوبی سے بے خبر ہیں۔ محمد واجد علی شاہ سا رنگین مزاج بادشاہ اور حکیم نواب مرزا سا بے چین زندہ دِل شاعر اس موقع پر نظر کرکے ذرا وہ مثنویاں آج بھی ہاتھ میں اٹھالو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس تصنیف میں زبان کے کیسے بیش بہا جواہر جھلک رہے ہیں۔ اُس وقت کے اہلِ کمال شعرا کو مضامین علمیہ کے بعد اگر کچھ دلچسپی تھی تو حُسن و عشق کے افسانوں میں یا ذکرِ عیش کی داستانوں میں۔ اربابِ ہنر دیکھیں گے کہ ان مثنویوں میں کیسی کیسی نگاری کا اعلیٰ علم صرف کیا گیا ہے۔ دُنیا میں شاعری کے دو نتیجے ہوتے ہیں۔ ایک تو صلہ اور دُوسرے داد یہ بات ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ فاضل مصنف ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک کے حاصل کرنے سے بھی محروم رہا ہوگا ہرگز نہیں۔ بے چین دل والے شاعر نے اپنے وقت میں نئے رنگ کی ایسی صنف لکھی جس کا سکہ آج تک لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ حریفوں نے ہزار منہ چڑھایا مگر جواب نہ آیا۔ نزاکتِ زبان اور محاوراتِ اُردوئے معلّٰی کا حظ اُٹھانے والے قیامت تک ان شوخیوں کا مزہ بھولنے والے نہیں۔ قومی نظم لکھنے والے بھی انہیں دو چیزوں کے خواہشمند ہیں یعنی ایک تو صلہ اور دوسرے داد ورنہ شاعری داخلِ عبادت و فرائض نہیں ہے۔ ہر وقت میں پیسہ حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں۔ زمانہ جس طرح اپنی رفتار بدلتا ہے اہلِ زمانہ بھی اُسی لکیر کے فقیر ہو جاتے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ حکیم صاحب مرحوم نے اگر بادشاہِ وقت کے خوش کرنے کو شاعری کے چند مذموم پہلوؤں کا لحاظ نہ کیا تو کچھ گناہ نہیں کیوں کہ بادشاہِ وقت کی خوشنودی مقتضائے وقت

تھی اور نیچرل شاعری کے مدعیوں نے تشبیہ و استعارات کی رنگینی سے قطع نظر کر کے خشک نظم و نثر میں قوم کا دکھڑا رو دیا تو حسبِ مقتضائے وقت یہ بھی کچھ جرم نہیں۔ اُس وقت اُس انداز سے حصولِ جاہ و مرتبت کی اُمید تھی اور اِس وقت کی شاعری نے قومی ہمدردی کو اکتسابِ دولت کا آلہ مقرر کر لیا ہے۔ بہرکیف دونوں شاعریوں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔ فقط زمانہ اور سوسائٹی کا فرق ہے جو دونوں میں تفاوت دکھا رہا ہے۔ ساٹھ ستر برس کی تصنیف کا اس وقت کی تہذیب و تمدن سے مقابلہ کرنا اہلِ انصاف کا کام نہیں۔ ہم تو جب جانیں کہ قومی ہمدردی کی شاعری منفعتِ ذاتی سے خالی ہو۔ کم از کم کتاب کی قیمت ہی سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے۔ مصرعہ

آدمی را بچشمِ حال نگر

سلطنت بدلنے کے بعد عوام کا طرزِ معاشرت بھی بدل جاتا ہے۔ خصوصاً ایسا انقلابِ سلطنت تو بہت بڑا تغیر پیدا کر دیتا ہے جب کہ تاج ایک قوم کے سر سے اُتار کر دوسری قوم کے سر پر رکھ دیا جائے جس کو باہم دگر مناسبت نہ ہو۔ ایسی صورت میں رفتار، گفتار، کردار، مراسم زبان، تہذیب، تمدن، تعلیم غرض ہر چیز میں تغیر و تبدل پیدا ہو جاتا ہے۔ مولوی حالی صاحب نے نواب احمد سعید خان بہادر لہارو کے مکان پر راقم آثم سے مومن خان اور مرزا غالب مرحوم کی چند نقلیں ایسی بیان کی ہیں کہ اگر میں اُن کو صورتِ اصلی میں لکھوں تو ضرور اُن مرحوموں کی رُوح کو صدمہ پہنچے گا۔ مگر مولوی صاحب نے غالب کی سوانح عمری لکھنے کے وقت واقعاتِ اصلی پر تصرفِ ذاتی کا ملمع چڑھا دیا ہے۔ بہرکیف اگلے لوگوں میں ظرافت و زندہ دلی کا مادہ بے حد تھا۔ اس وقت کے شعرا کو دُنیاوی ضرورتوں نے ایسا غمگین و افسردہ دل کر دیا ہے کہ مہینوں چہرے پر ہنسی نہیں آتی ظرافت اور زندہ دلی کا تو خدا حافظ ہے۔

ہر طبقہ کے شاعروں کو ضرورت نے مجبور کیا ہے کہ اپنی تصنیفات میں زندہ دلی اور ظرافت کا رنگ چمکائیں۔ ہندوستان کے شعرا کا ذکر کرنا تحصیلِ حاصل ہے کیوں کہ سوداؔ انشاؔ

جرأت میر ضاحک وغیرہ کے انداز سے بچہ بچہ واقف ہے۔ اب ہم یورپ کے مہذب طبقہ کے چند شاعروں کی مثال پیش کر کے اپنے استدلال سے قطع نظر کرتے ہیں۔

بائرن کا ڈان جون (Don Juan)

اور شیکسپیر کا ریپ آف لیوکریشیا (Rap of Lucratia)

ملٹن کا پیرڈائز لاسٹ (Paradise Last)

رینالڈ کی بے انتہا تصنیفات

بہت سے شرمناک خیالوں سے بھری پڑی ہیں جو انگریزی معزز سوسائٹی کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ پھر ہندوستانی شعرا نے کیا گناہ کیا ہے کہ وہ محض ایک مرتاض زاہد صد سالہ بن کر شاعری کے ظرافت خیز اور ولولہ انگیز خیالات کے اظہار میں خاموشی اختیار کریں۔ اگر معترضانہ نظر ڈالی جائے تو کسی شاعر کا کلام اعتراض سے بچ نہیں سکتا کیوں کہ انسان بہر صورت انسان ہے۔ میں صرف مثال کے طور پر تھوڑا انتخاب بلکہ ایک ہی قطعہ سے چند اشعار خواجہ صاحب کے لکھے دیتا ہوں اور اس معاملہ میں زیادہ کوشش منظور نہیں کیوں کہ یہ میری کتاب کچھ مناظرے کی کتاب نہیں اور نہ خدا نخواستہ مجھے مولوی صاحب سے کوئی مخاصمت ہے۔

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۳ھ بمقام حیدر آباد

اس قطعہ کی تمہید میں جھوٹ نہ بولنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور مبالغۂ شاعرانہ سے نفرت ظاہر کر کے نیچرل مذاق کی شاعری کا دعوے کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دعوے کہاں تک سچا ہے۔

بشیر دولت و دیں صدر اعظم امرا نہیں ہے جس کا کوئی قرب شہ میں ہم پایہ

اس قطعہ کے قافیے آیا پایا وغیرہ ہیں اور اس میں الف ردی واقع ہوا ہے واقفان فن نے بضرورت شعر کے لئے پایہ اور سایہ وغیرہ کی (ہ) کو الف سے بدل لیا ہے مگر وہ ہائے ہوز الف

سے نہیں بدلی جاسکتی کہ جو حالتِ اضافت میں ہو یا مرکب ہو اور یہ نقص اس شعر میں موجود ہے کیوں کہ لفظِ ہم پایہ مرکب دو لفظوں سے ہے اس لئے یہ (ہا) الف نہیں ہو سکتی ؎

جو ظلِ حق ہے رعیت کے سر پہ شاہِ دکن

تو اعظم الاُمرا ظلِ حق کا ہے سایا

اس شعر میں غلطی معنوی موجود ہے کہ چوں کہ سایہ جسم مادی نہیں اس لئے سایہ کا سایہ غیر ممکن ہے ؎

زمانِ حال سے ماضی کو دیکھیے کیا نسبت

اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا

ممدوح کے انتظام سے منتظمانِ سابق کی بد نظمی ظاہر کی ہے یعنی بشیر الدولہ کی وزارت کے قبل حیدر آباد میں بڑا اندھیر اور ظلم تھا۔ یہ اگر جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ باوجودیکہ سالار جنگ اول یا دیوان چندو لال کی وزارت دکن کی تاریخ میں قابلِ مدح ہے۔ اب اگر کوئی شاعر موجودہ وزیر کی مدح سرائی کرے تو وہ ایسے ہی مبالغوں سے کام لے گا۔ پس اس صورت میں مولوی صاحب کی شاعری کی کوئی خاص نوعیت ہم پر ظاہر نہ ہوئی ؎

وہ چونک اُٹھے کہ گویا قیامت آپہنچی

جو در پہ آکے کوئی داد خواہ چلّایا

داد خواہ کا چلّانا کس قدر مکروہ معلوم ہوتا ہے اور یہ عمل ہی سراسر دلیلِ بد انتظامی ہے اور چونک اُٹھنے سے ممدوح کی بزدلی کا اظہار کیا ہے۔ یہ شعر فاضل شاعر کے درجۂ تصنیف سے بہت گرا ہوا ہے۔

وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج

جو شاہراہ میں پتّہ کسی نے کھڑکایا

اس شعر میں اوّل تو باعتبارِ شانِ محاورہ لازمی متعدی کا جھگڑا صورتِ محاورہ میں نقصان پہنچا رہا ہے یعنی محاورہ یوں ہے کہ پتّہ کھڑکا۔ پتّہ کوئی کھڑکاتا نہیں۔ دوسرے شاہراہ میں پتّہ کھڑکانا اور

قافلہ کا تاراج ہونا ایک انوکھا خیال ہے جو آج تک کسی کے کلام میں دیکھا نہیں گیا۔ شاہراہ اُس مقام کو کہتے ہیں جو عام راستہ ہو اور اُس راستے پر ہر وقت راہ گیروں کا عبور ہوتا ہے۔ ایسے مقام پر قافلہ کا لٹنا منافیِ عقل و خلافِ قیاس ہے۔ علاوہ اس کے مفہومِ شعر سے ممدوح کی بزدلی ثابت ہوتی ہے کہ وہ پتے کی کھڑک کو بھی قافلے کی تاراجی سمجھتا ہے تو کیا اپنے انتظام سے مطمئن نہیں اور یا ایسے واقعات اُس کے زمانۂ وزارت میں اکثر واقعات ہوتے رہتے ہیں خُدا جانے اس نظم سے شاعر کا مقصود کیا ہے۔ میرے نزدیک تو ہجوِ ملیح ہے اور تمام قطعہ میں یہ تلمیح پائی جاتی ہے۔

رہینِ منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام — کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا

شراب و کباب کا لفظ مولوی صاحب کی نظم میں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے اور پھر ماہِ مبارکِ رمضان گذرنے کے بعد روزہ داروں کی دعوت کے لئے اچھی چیز تجویز فرمائی۔ آپ جھوٹ تو بولتے نہیں شاید درحقیقت ایسا ہی ہوگا۔ بہتر ہوتا جو سیندھی کا ذکر کرتے کیوں کہ حیدرآباد کے لئے یہ نیچرل مضمون تھا۔

چراغ اُکسایا

یہ محاورہ اہلِ لکھنؤ کی زبان پر تو بتی اُکسانا ہے۔ اہلِ دہلی کا حال مجھے معلوم نہیں کیوں کہ دونوں شہر والوں میں اختلافِ زبان واقع ہے اور دونوں بجائے خود آزاد ہیں۔ اس بحث کو مفصل لکھنا میرا فرض نہیں۔ اگرچہ مرزا داغ مرحوم کی سوانح عمری میں لائق مؤلف نے لکھنؤ اور دہلی کی زبان کا تقابل کر کے اپنے اُستاد کی فوقیت کا اظہار کیا ہے مگر اس میں فاضل مؤلف نے کیا فائدہ اُٹھایا ہے جو میں اٹھاؤں گا۔ اس قسم کے دعووں کو اہلِ کمال حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنی زبان اور اپنا محاورہ ہر شخص کو مانوس ہوتا ہے۔ اہلِ دہلی کا یہ دعوٰے ہے کہ

اُردوئے معلّیٰ کا مخزن دہلی ہے اور یہ فیض اہلِ دہلی سے اہلِ لکھنؤ کو پہنچا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ بات قبول کریں تو بھی اس بات کے مدعیوں کو کوئی کافی فائدہ پہنچنے کی امید نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جب خود اربابِ دہلی لکھنؤ اور دہلی کے محاورات کا فرق دکھا کر ایک امتیازی شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بیان فرماتے ہیں کہ لکھنؤ میں اس لفظ کو یوں بولتے ہیں اور دہلی میں یوں کہتے ہیں۔ لکھنؤ میں یہ محاورہ یوں استعمال ہوتا ہے اور دہلی والے یوں استعمال کرتے ہیں تو پھر دہلی کی فیاضی غریب لکھنؤ کے حال پر کہاں باقی رہی۔ اب تو اس کی زبان کا معیار ایک جُداگانہ قائم ہو گیا اور مصلحانِ زبانِ لکھنؤ نے اُس پُرانے لباس کو اُتار کر پھینک دیا بس فاضل مؤلف کی نسبت اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا مقتضائے ارادتِ شاگردی یہی تھا اور مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اور نہ میں ان متعصبانہ خیالات سے کوئی نتیجہ نکالتا ہوں۔ دہلی کے اکثر اہلِ کمال فصحائے لکھنؤ کے قدر داں ہیں اور لکھنؤ کے اکثر سخن شناس صاحب کمالانِ دہلی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اربابِ ہنر ایسے مناظرات سے نفرت کرتے ہیں اور جو پسند کرتے ہیں اُن کے لئے گنبد کی آواز ہے اور پدرم سلطان بود کا جواب بھی میرے پاس نہیں ہے۔

مرزا داغ سے حیدر آباد کی صحبتوں میں نیاز مند سے اکثر محاورات و اصطلاحات کی نسبت بحث رہی ہے۔ مرحوم ایک مُنصف مزاج آدمی تھے اور معقول بات کو مان لیتے تھے چنانچہ اس شعر کی نسبت بھی ایک مرتبہ گفتگو ہوئی ؎

دیکھنے کے لئے اک سانس لگا رکھا ہے ورنہ بیمارِ شبِ ہجر میں کیا رکھا ہے

میں نے کہا کیوں حضرت آپ سانس کو تذکیر کہتے ہیں۔ فرمایا ہاں۔ میں نے کہا آپ اپنے اُستاد کی تقلید نہیں کرتے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد سینے میں سانس ہوگی اَڑی دو گھڑی کے بعد

مرزا صاحب کھوئے گئے اور غور کرنے لگے۔ میں نے کہا آپ کیا غور فرما رہے ہیں۔ سانس کی

خبر قافیہ میں تانیث واقع ہوئی ہے اس وجہ سے تحریف کی گنجائش نہیں یا یہ غلطی اُستاد کے لئے قبول فرمائیے یا اپنے لئے۔

مرزا صاحب نے تاویل کر کے فرمایا کہ امتدادِ زمانہ سے اس لفظ میں تغیر واقع ہو گیا ہے مگر یہ جواب معترض کے سکوت کے لئے کافی نہ تھا۔ بہر کیف سوانح عمری کے اندازِ تحریر نے جہاں ایک وطنی جنگ چھیڑی ہے وہاں بڑے شاعر کے اعزازِ ذاتی کو بھی بہت کچھ نقصان پہنچایا ہے اور اخبار والوں نے بہت کچھ خاکہ اُڑایا ہے۔ یہ بات میں بآوازِ بلند کہنے کو تیار ہوں کہ لائق مؤلف نے اپنے اُستاد کے اُن شرمناک رازوں کو بہت سستا بیچ ڈالا جن کو اعلیٰحضرت نظام دکن نے بڑی قیمت دے کر مول لیا تھا۔

مرثیہ اور مبالغہ

اعتراض کرنے والے یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ میر انیسؔ نے مرثیوں میں صنعتِ مبالغہ کے طومار باندھے ہیں جو اس صنعت کے لئے ناموزوں اور غیر مناسب ہیں مگر راقم الحروف کے نزدیک یہ معترض کی غلطی ہے کیوں کہ میر انیسؔ کا مرثیہ صرف مرثیہ ہی نہیں ہے بلکہ شاعری کی ہر صنعت کی مثال ہے۔ یہ ایک مجموعہ ہے جس سے ہر قسم کے مذاقِ شاعری کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ مرثیہ کا چہرہ قصیدہ نما شاعری ہے جس میں تمام دُنیا کے مسائلِ علمیہ اور فنونِ مختلفہ کا خاکہ اُتارا ہے ایک کافی حد تک مظاہرِ قدرت، قوتِ شاعری، صنعتِ مبالغہ، معرفت، حقائق روحانیات، خصائلِ انسانی، شاعرانہ خود ستائی، گل و بلبل، بہار و خزاں، حسن و شباب، رزم و بزم کے کارناموں سے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں۔ عُرفی اور قاآنی کے قصائد کی تشبیب کو بلند پروازی کے آسمان پر پامال کرتے ہوئے فلک الافلاک سے گذر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی اولوالعزمی اور خیال بندیوں سے مقاصدِ مرثیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور جن پر شاعرانہ طبع آزمائی کا مدار ہے

وہ سب ضمنی باتیں ہیں اور اس آزادی کے مخترع و موجد خود میر انیس ہیں۔ شاعری کی ہر صنف کا ہر شعبہ اُن کے مرثیہ سے یوں ملحق ہے جس طرح عظیم الشان سمندر سے تمام دریاؤں کا تعلق اس اعتبار سے تمام اصنافِ سخن اس کُل کا جُز قرار پاتے ہیں اور مرثیہ کے معیار پر اُن کا کلام پُورا اُترتا ہے۔ واقعاتِ تاریخی اور مرویاتِ احادیث کو صنعتِ مبالغہ اور تصرفاتِ شاعرانہ سے شاعر نے ہر جگہ بچا لیا ہے۔ یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ بہن بھائی کی گفتگو ماں بیٹے کی تقریر۔ بیٹے کی لاش پر ماں کے بین۔ بھائی کا بہن سے رخصت ہونا عزیز و انصار کی شہادت سے اہل حرم کی بے قراری۔ بچّوں کی پیاس۔ مجاہدین کی حیرت انگیز جنگ لشکرِ کفار کی کثرت، فوجِ خدا کی جاں بازی، مخدراتِ عصمت کے خیموں کا جلایا جانا۔ روزِ عاشورہ کی گرمی امام حسینؑ کے زخموں کی تعدادِ کثیر، اہلِ بیتؑ کی گرفتاری، سیّد الساجدین کی قافلہ سالاری دربارِ یزید کی بداخلاقی۔ ان سب واقعات سے ثقات راویوں کی کتبِ تاریخ مملو ہیں یا نہیں میر مرحوم نے ان حادثات کا عربی علمِ ادب سے اُردو لٹریچر میں ترجمہ کیا ہے اور یہ ترجمہ خیالات و جذبات کا ہے محض الفاظ کا ترجمہ نہیں ہے۔ شاعر نے اُردو علمِ ادب کو فصاحت کے آبِ حیات میں غوطہ دے دے کر اپنے محاورات و مصطلحات کی قادر الکلامی دکھائی ہے اور خاندانِ رسالتؐ کے مراسم اور طرزِ معاشرت کو ہندوستان کے ایک شریف خاندان کی طرزِ معاشرت کے مطابق دکھانے کا ارادہ کیا ہے اور پھر اُن سوانح میں اپنی زبان اور شاعری کا اثر بھرا ہے یہ دیکھنا ہے کہ اُردو ادب میں اُن کی شاعری کے رموز کن کن جذبات کا پتہ دیتے ہیں اور فصیحِ عرب امام کے گھرانے کی زبان اور باہم چھوٹے بڑوں کا حفظِ مراتب یا خاندانی مدارج کو کس قدر مہذب پیرایہ میں نظم فرمایا ہے اور اسی تخئیل نے کیرکٹر کی اصلی شان دکھائی ہے۔ کیرکٹر نگاری ایک ایسی صفت ہے جس کا امتیاز ہندوستانی شعرا میں کمیاب ہے اس لئے میر انیسؔ کی شاعری ابھی تک عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ تلوار کی تعریف اور گھوڑے کی سُرعت مجاہدین کی فوق العادت بشری کارناموں کی نسبت مسلمانوں کے ایک گروہِ خاص کی عقیدت یہ کافی جواب

دیتی ہے کہ جن کی تلوار یا گھوڑے کی تعریف میں شاعر رطب اللسان ہے وہ کون تھے اور کیسے تھے، اگر اُن کے مرتبۂ خاص و اعجازِ امامت کی نسبت کچھ شبہ نہیں تو مبالغہ کا اعتراض ہٹا لینے کے قابل ہے۔ دشمنانِ اہلِ بیتؑ کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دینا اُن کی معجز نمائی کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا مگر وہ مشیتِ ایزدی کے پابند تھے اور قدرت کو اُن کے صبر و استقلال پر اطمینان تھا اس لئے اُس تین روز کی بھوک اور پیاس میں سُوکھی اور اینٹھی ہوئی زبان نے اُمتِ رسولؐ کے لئے کوئی بد دُعا نہیں کی اور ایک قدم بھی میدانِ امتحان میں طریقِ ہدایت و اطاعتِ ایزدی سے باہر نہیں رکھا وہ جنت میں اُن پیچیدہ اور ہولناک راستوں سے داخل ہوئے ہیں جس کا نقشہ روزِ ازل بنایا گیا تھا اور وہ ہمیشہ سے اُس راہ پر چلنے کو تیار تھے۔ آخر قوم کے ناگوار و ناگزیر مظالم سہ کر بوڑھے بچے، جوان ہنستے کھیلتے شاداں و فرحاں اس دشوار گذار مرحلے کو طے کر گئے امتحان کی سختیوں نے اُن کے دلوں میں کوئی ہراس پیدا نہ کیا۔

صاحبِ اختیار امام ہمام نے نوجوان گود کے پالے حسینوں کی لاشوں کو میدانِ قتال سے اہلِ حرم کے خیامِ مقدس تک لانے میں تسلیم و رضا کے منازل طے کئے اور شکایت کا ایک لفظ بھی زبان سے آشنا نہ ہوا۔ شیر خوار چاند کے ٹکڑے کو بے درد حُرملہ کے تیرِ ستم کا نشانہ بنانے کو اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں پر بلند کر دیا اور پھر اُس آسمانِ امامت کے چمکتے ہوئے تارے کی قبر اپنے ہاتھ سے بنا کر خدا کا شکر بجا لائے۔ اپنے مراتب سے قطع نظر کر کے زمینِ قبر جناب علی اصغرؑ سے خطاب فرماتے ہیں:۔

پہلے پہل چھٹا ہے یہ ماں کے کنارے سے — واقف نہیں ہے گور کی شب ہائے تار سے
اے قبر ہوشیار مرے گلعذار سے — گردن چھدی ہوئی ہے بچانا فشار سے

سیّد ہے لال حضرتِ خیر النساءؑ کا ہے
معصوم ہے شہید ہے بندہ خدا کا ہے

پہلے مصرع کی نیچرل شاعری کے الفاظ صاحبانِ اولاد کے دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں ہمیشہ

کے لئے اپنی ماں کی گود سے علیؑ اصغر کا جُدا ہونا درحقیقت اُس شیر خوار کی شہادت کا پہلا ہی روز تھا۔ دوسرے مصرع میں عجب نازک خیالی صرف فرمائی ہے۔ یوں تو کوئی انسان مرنے سے پہلے قبر کی شبِ تاریک سے واقف نہیں ہو سکتا مگر نازک خیال شاعر کا مفہوم کچھ اور ہے یعنی جوان یا بوڑھے صاحبانِ عقل اصولِ دینیہ کی رو سے عقوباتِ بعد الموت کا امتیاز رکھتے ہیں لیکن چھ مہینے کے بچے کو قدرت کی جانب سے یہ امتیاز نہیں بخشا گیا ہے۔ پس حضرت کا یہ مقصود ہے کہ میرے نادان بچے نے کبھی یہ سُنا بھی نہیں ہے کہ قبر کی شبِ تار ہولناک ہوتی ہے۔ اس لئے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ چوتھا مصرع کیا اہلِ دل سُننے کی تاب لا سکتے ہیں اور اس سے بہتر نیچرل شاعری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ واقعۂ اصلی میں مبالغہ سے زیادہ دردناک الفاظ کا اثر بے چین کر رہا ہے۔ بیت کی تنقید کو ایک کافی ضخامت کی ضرورت ہے۔ میرا فرزند ہے امام زادہ ہے۔ قابلِ تعظیم و تکریم ہے۔ یہ کچھ نہیں فرماتے معبودِ حقیقی کی عبدیت کے پابند سید الشہداؑ فقط یہی ارشاد فرماتے ہیں کہ سیّد ہے معصوم ہے شہید ہے بندۂ خدا ہے۔ چاروں صفتیں اپنی قدرتی بے کسی کی گواہِ عادل ہیں ایک صفت کو بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شہزادہ علی اصغر کے لئے مبالغہ ہے یا مظلوم باپ نے اضطراری حالت سے بے چین ہو کر زمین کو اپنے مرتبۂ امامت سے دُہرایا ہے اپنے مدارج و مراتب پر بمقابلۂ رضائے الٰہی فخر و مباہات نہیں کیا اور اپنے معصوم بچے کے لئے پُر درد مگر اُن معمولی الفاظ میں حفاظت کی التجا کی ہے جو خدا کا ایک معمولی بندہ بھی کر سکتا ہے۔ اس حُسنِ بیان سے دُنیا کا کوئی شاعر جذباتِ صادقہ کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ اِن خیالات کا نظم کرنا صرف میر انیسؔ ہی کا کام تھا۔ عشقیہ اور بہاریہ مضامین کے پُرتکلف استعاروں میں تو قریب قریب ہر شاعر کی طبیعت رنگینیاں دکھا سکتی ہے مگر فصاحت کی بلند چوٹی پر اس راہ سے پہنچنا ہر شخص کا کام نہیں۔

لہٰذا ایسے برگزیدہ بارگاہِ صمدی کی حمد و ثنا میں کسی مبالغہ کو مبالغہ نہیں کہہ سکتے۔ میر انیسؔ کے ہر ایک ہیرو کا بامِ فضیلت اس قدر بلند ہے کہ مبالغہ کی سیڑھیوں کے ذریعے سے بھی

شاعر اُس بلندی پر نہیں پہنچ سکتا اور سارا مبالغہ اور تمام عنوانِ تعریف ممدوح کی شان سے پست نظر آتا ہے یہ فقط میر انیس ہی تھے کہ اُنھوں نے خاندانِ رسالتؐ و امامتؑ کے مراتب کو پہچانا۔ یہ خدمت قسامِ ازل نے اُن کی ذات میں ودیعت رکھی تھی وہ اس کو پورا کر گئے اور اُن کا تمام کلام واقعاتِ اصلی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ اپنی قوتِ شاعری سے تیرہ سو برس کے واقعات کا نقشہ اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ زمینِ کربلا کی فضا ہیں کھینچ کر ہندوستان کی سرحد سے مل جاتی ہیں اور چشمِ بصیرت کے سامنے وہ نظارہ پیش ہو جاتا ہے۔

میر انیسؔ نے مدح و ثنا کے گلہائے نظم ہمیشہ بزرگانِ دین اور خاندانِ رسالتؐ کے مقدس مزاروں پر چڑھائے ہیں۔ دولت مندوں کے درباروں میں اُن کی نظموں کے گلدستے باعث آرائشِ محفل نہیں ہوئے۔

خوشامدانہ مدح سرائی شاعروں کے جذباتِ اصلی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ٹینیسن نے بہت مدت تک خطابِ ملک الشعرائی قبول کرنے سے انکار کیا جس کا سبب وہ یہ بیان کرتا تھا کہ بادشاہِ وقت کی تعریف میں قصیدے کہنا پڑیں گے اور اس صنف سے میری طبیعت کو لگاؤ نہیں ہے۔

میر انیسؔ مرحوم نے سب سے پہلی مجلس اکرام اللہ خان کے امام باڑے[1] میں پڑھی ہے۔ میر ضمیر صاحب کا دور تھا اور میر خلیق اُن کے ہمعصر تھے۔ امام باڑۂ مذکور میں مقررہ مجلسیں ہوتی تھیں اور یہ دونوں صاحب اپنے اپنے کمال کا اظہار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجلس شروع ہونے سے پیشتر میر خلیق مرحوم نے میر ضمیر مغفور سے کہا میں چاہتا ہوں کہ آج آپ کے بھتیجے سے بھی کچھ پڑھواؤں۔ یہ اشارہ میر انیسؔ کی جانب تھا۔ میر ضمیر مرحوم نے فرمایا بسم اللہ۔ میر انیسؔ اپنے والد کے حکم سے منبر پر گئے اور اپنا کلام پڑھ کر اہلِ لکھنؤ پر اپنے اندازِ نظم و طرزِ خواندگی

---

[1] اکرام اللہ خان کا امام باڑہ لکھنؤ کے محلہ نخاس میں ایک پرانی منہدم عمارت ہے۔ قدامت و عظمت کے صرف آثار باقی رہ گئے ہیں لیکن اس وقت بھی بڑے بڑے نامور ذاکروں کے پڑھنے کی مجلسیں اُس میں ہوتی ہیں۔

کا اثر پھیلا دیا اور اُسی روز سے میر انیسؔ کو مقبولیتِ عام کا خلعت حاصل ہو گیا۔ نوجوان فرزندِ رشید نے بوڑھے باپ کو بسترِ راحت پر آرام کرنے کی مہلت دی اور خود میدان میں نکل آئے۔ حالات زبانی شیخ حسین بخش صاحب[1] تحریر ہوتے ہیں۔

میر و میرزا کی یک جا خوانندگی

محمد واجد علی شاہ کی والدۂ معظمہ ملکۂ کشور صاحبہ مرحومہ نے ایک مجلس قرار دی اور اس مجلس میں دونوں صاحبوں کو مرثیہ پڑھنے کا حکم ہوا۔ میر صاحب نے کہا کہ مجھے مرثیہ پڑھنے میں کچھ عذر نہیں کیوں کہ ذاکرِ امام حسینؑ ہوں مگر عذر اس امر میں ہے کہ ذاکری کی حالت میں دربار کا حفظِ مراتب مجھ سے نہ ہو سکے گا البتہ اپنی معمولی پوشاک سے حاضر ہو سکتا ہوں۔ میر انیس مرحوم کی یہ درخواست منظور ہوئی۔ دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ جناب مرزا صاحب مرحوم قبائے درباری پر عمامہ باندھے تھے اور میر انیس مرحوم اپنے سادہ لباس پر چگوشیہ ٹوپی پہنے تھے پہلے مرزا صاحب مرحوم منبر پر تشریف لے گئے اور حسبِ مقتضائے وقت بادشاہ کی تعریف میں کچھ نظم پڑھ کر مرثیہ شروع کر دیا۔ اس کے بعد جنابِ انیس مرحوم منبر پر تشریف لے گئے اور یہ سلام شروع کیا۔

غیر کی مدح کریں شہ کے ثناخواں ہو کر | مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر

جب میر انیسؔ نے سلام کا تیسرا شعر پڑھا۔

زُلفِ اکبرؑ کو جو دیکھا سرِ نیزہ پُر خوں | موئے سر کھول دیئے ماں نے پریشاں ہو کر

---

[1] شیخ حسین بخش صاحب ایک مقدس بزرگوار شرفائے لکھنؤ سے ہیں اور خاندانِ میر انیسؔ کے دلدادہ ہیں میر انیسؔ سے لے کر اخی المعظم میر علی محمد صاحب عارفؔ کی خدمت میں نسلاً بعد نسلٍ حاضری کا شرف حاصل ہے اور کمال حسنِ عقیدت رکھتے ہیں۔

بس چلمن اُلٹ کر بادشاہ باہر نکل آئے اور بے ساختہ فتح الدولہ برقؔ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیوں فتح الدولہ میں نہ کہتا تھا کہ میر انیسؔ لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ دیکھا تم نے یہ زبان اُنہیں کے لیے خاص ہے بعد ختم مجلس علی نقی خان کو حکم دیا کہ میر صاحب کو دروازے تک رخصت کرنے کی رسم پورا کریں۔ یہ بات غلط مشہور ہو گئی ہے کہ میر انیسؔ نے دربارِ بادشاہ اودھ میں جانے سے انکار کیا چنانچہ مذکور الصدر واقعہ سے مجلسِ شاہی میں مرثیہ پڑھنا تو ظاہر ہے اور حسب الطلب دربار کی حاضری بھی ایک دوسری نقل سے ثابت کروں گا۔ میر انیسؔ کچھ ایسے بداخلاق نہ تھے کہ بادشاہِ وقت کے حکم کو رد کرتے اور بادشاہ کچھ ایسے ناقدردان نہ تھے کہ ایسے صاحبِ کمال کو رونقِ دربارِ شاہی نہ سمجھتے مگر بات یہ ہے کہ میر مرحوم نے کوئی شاہی خدمت پسند نہ کی اور نہ کسی خاص سرفرازی کے امیدوار ہوئے۔ وہ قدرت کی جانب سے ایسا دل لائے تھے کہ جن کو مالِ دُنیا کی جانب رغبت نہ تھی۔ وہ اپنی سادہ زندگی کو ایسے تعلقات سے بچاتے تھے جن میں دنیاوی تزک و احتشام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اہلِ دنیا کو جن مراتب سے سرور حاصل ہوتا ہے وہ اُن کے لئے باعثِ تکلیف قرار پا چکے تھے کیوں کہ اُن کے مزاج کی افتاد بے غرضانہ واقع ہوئی تھی اور وہ اپنے مبارک زمانۂ حیات کو بے حد سنجیدگی سے پُورا کرکے ملکِ عدم کے باشندوں میں جا ملے۔ نوّر اللہ مرقدہٗ۔

نقل

ایک مرتبہ شاہِ اودھ محمد واجد علی شاہ مرحوم نے چاہا کہ شاہنامہ کے طور پر اپنے خاندانی حالات نظم کرائیں۔ اس خدمت کے لئے چار شاعر مشاہیر سے تجویز فرمائے۔ فتح الدولہ محمد رضا خان برقؔ۔ تدبیر الدولہ منشی منظفر علی خان اسیرؔ۔ مرزا مہدی قبولؔ اور ان چاروں صاحبوں کی رائے سے پانچویں میر انیسؔ مرحوم۔ اور یہ بات قرار پائی کہ تھوڑا تھوڑا حصہ تاریخ کا ان چاروں

شعراء پر تقسیم کر دیا جائے۔ اس التزام سے کتاب جلد تمام ہو جائے گی اور ہر شاعر کی طبیعت کا رنگ بھی علیحدہ علیحدہ قائم ہو جائے گا۔ غرض میر انیس مرحوم دربار میں طلب ہوئے اور یہ تجویز پیش کی گئی، میر انیس مرحوم نے بھی اخلاقاً اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے علی نقی خان وزیر کی جانب اشارہ کیا کہ میر انیس مرحوم کے ہمراہ جائیں اور مصاحب منزل کے کمرے دکھائیں جو کمرہ میر صاحب پسند فرمائیں اُن کے قیام کے لئے اسباب راحت وہاں جمع کر دیا جائے اور یہ کام شروع ہو جائے۔ میر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ خدمت اس پابندی سے لی جائے گی کہ مجھے شب و روز یہاں رہنا پڑے گا تو بے دل ہو گئے اور براہِ امتثالِ امر علی نقی خان کے ہمراہ ہوئے اور مصاحب منزل کے کمرے دیکھنے لگے۔ نواب صاحب ہر کمرہ دکھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ یہ آپ کو پسند ہے۔ آخر میر انیس نے پریشان ہو کر فرمایا صاحب بہ

غریبوں کی کیا موت کیا زندگی　　　جگہ جس جگہ مِل گئی مر رہے

آخر میں میر صاحب نے کسی حیلے سے انکار کر دیا اور اُس شاہنامہ کا کوئی سلسلہ شروع ہونے نہ پایا تھا کہ زمانہ نے سلطنت کا ورق اُلٹ دیا۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند　　　صحبتے بر خواست مے باقی نماند

مذکور شعر کی تلمیح کو اِس واقعہ سے تعلق ہے اور اِس شعر کے لئے پھر میر صاحب نے پُورا سلام لکھا ہے۔ دیکھو مطبوعہ کلیاتِ میر انیس مرحوم۔ اس نقل سے بھی دربارِ بادشاہ میں میر انیس کا تشریف لے جانا ثابت ہے۔ یہ واقعہ زبانی نواب محمد زکی خان تحریر کیا گیا ہے۔

میر صاحب گھر سے بہت کم نکلتے تھے خاص خاص تقریبوں یا مجلسوں کے علاوہ وہ کسی رئیسِ شہر کی ملاقات کو کم جاتے تھے۔ میرے والد مرحوم کو میر صاحب کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ اکثر سہ پہر کو والد کے ہمراہ غریب خانے پر تشریف لاتے تھے۔ راقم کا موروثی مکان لبِ سڑک ایک عمدہ تفریح گاہ ہے اور میرے نانا حکیم نواب مرزا شوق مرحوم سہ پہر کو باہر نشست فرماتے تھے اور اکثر عمائدِ شہر اور اہلِ کمال کا مجمع اُن کی صحبت میں رہتا تھا۔

یہ دلچسپی میر انیس مرحوم کو بھی اکثر وہاں پہنچا دیتی تھی۔

نقل

ایک روز میر انیس مرحوم حسبِ دستور غریب خانہ پر تشریف رکھتے تھے کہ ایک رئیس کی گاڑی سامنے سے گذری۔ رئیس نے کوچوان سے اشارہ کیا کہ گاڑی آہستہ سے چلے تاکہ میر صاحب متوجہ ہوں تو سلام کریں۔ میر صاحب نے فوراً ارادہ سمجھ لیا اور اس جانب سے منہ پھیر کر کسی اور شخص سے گفتگو کرنے لگے مگر کنکھیوں سے دیکھتے جاتے تھے اور والدِ مرحوم سے پوچھتے جاتے تھے کہ میر حسن علی گاڑی نکل گئی۔ جب والد نے عرض کیا کہ حضور ہاں تو فرمایا لاحول ولا قوۃ کیا میں پریشان ہوا ہوں۔ والد مرحوم نے کہا کہ حضور وہ منتظر تھے کہ سلام کرلیں۔ کیا مضائقہ تھا جو آپ اُس طرف توجہ فرماتے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اس شخص کی صورت سے مجھے نفرت ہے۔ اس نے سلطنت سے بے ایمانی کی ہے اور ہزاروں بے گناہوں کی گردن پر چھری پھیری ہے میں کیا ہوں رحمتِ خدا نے بھی ایسے لوگوں کی جانب سے منہ پھیر لیا ہے۔ والد مرحوم فرماتے تھے کہ اس بد اخلاقی پر ہمیں کبھی کبھی خیال ہوتا تھا مگر اُس روز یہ راز کھل گیا اور ہماری تسکین ہوگئی۔ درحقیقت میر انیس اُن لوگوں سے نفرت کرتے تھے جنہوں نے دولت حاصل کرنے کے لئے ناجائز طریقِ عمل اختیار کیا تھا۔ اُن کا قول تھا کہ گناہ گاروں کے مکروہ چہرے کو دولت مندی کی نقاب نہیں چھپا سکتی اور نہ شرافت کے جوہرِ اصلی کو مفلسی کا مورچہ کھا سکتا ہے معمولی تواضع اور اخلاق سے دولت مندوں کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اُن کی ظاہری کسرِ نفسی پر فریفتہ ہوکر لوگ اُن کے بڑے بڑے گناہوں کو بھول جائیں۔ جو شخص جوا کھیلتا ہے یا کسی کو قتل کرتا ہے اور اُس کی عقوبت میں پھانسی کی رسّی پر لٹکایا جاتا ہے۔ وہ اصلی مجرم نہیں ہے۔ اصلی مجرم وہ شخص ہے جو اپنی دولت کے ذریعہ سے غریبوں کی جانوں کا شکار کھیلتا ہے۔

اور مہلک تدابیر سے اپنے افراد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کے ادنےٰ ترین طبقہ کا ایک دولت مند اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے ایک شریف خاندان کا سید شوہر تجویز کرتا ہے اور اس تدبیر سے اپنی آیندہ نسل کے لئے اس مقدس خطاب کو مول لے لیتا ہے۔ اپنے خاندانی رشتہ داروں پر حقارت سے نظر کرتا ہے اور اُن کے موروثی حقوق پامال کرنے کے لئے اپنی دولت صرف کرنے میں دریغ نہیں کرتا اور غیر مستحقین کے ساتھ سلوک و مراعات کرکے اُن کو بھیک مانگنا سکھاتا ہے۔ وہ دُنیا کو بازی گاہ سمجھتا ہے مگر وہ بازی گاہ جہاں قومی ہمدردی کے کھیل نہیں کھیلے جاتے بلکہ ظلم و جبر کے تماشے دیکھنے کو اُس کی آنکھیں کھلی ہیں۔ یہ تماشے اُس کی مستعار زندگی کے لئے دل خوش کُن ثابت ہوتے ہیں۔ مگر اپنے بعد وہ اُس مکروہ دولت کو اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے جس کو بے حد کاہشوں اور مظالم یا سیاہ کاریوں سے جمع کیا تھا اور پھر اُس عظیم الشان دولت کا ایک پیسہ بھی اُس کے اعمالِ آخرت کے کام نہیں آسکتا۔ وہ سب کا سب شراب خواری اور سیہ کاری میں صرف ہو جاتا ہے۔ اللھم الاحفظنا۔

نقل

ماہِ رمضان میں نمازِ جماعت تحسین کی مسجد میں ہوتی تھی۔ جناب قبلہ و کعبہ سید تقی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ نماز پڑھاتے تھے اور تمام رؤسائے شہر کا مجمع ہوتا تھا۔ مصلی اپنے اپنے خادموں کے ہاتھ مصلے پہلے سے روانہ کر دیتے تھے کہ مقررہ مقام پر بچھا کر منتظر رہیں۔ میر انیس مرحوم جناب قبلہ و کعبہ کے ہمراہ براہِ باغ[1] مسجد میں داخل ہوتے تھے۔ صفوفِ نماز مرتب ہو چکیں

---

[1] میر صاحب کے مکان سے قبلہ و کعبہ کے باغ میں ایک دروازہ لگا ہے جس راہ سے میر صاحب اکثر قبلہ و کعبہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

صحنِ مسجد نمازیوں سے مملو ہے۔ ہر شخص آمادۂ تکبیر پر کان لگائے ہوئے ہے کہ ایک رئیس اُس مجمع میں کھڑے ہو گئے۔ میر صاحب نے دیکھا اور ارادہ پہچان کر کسی دوسری جانب مخاطب ہوئے۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ کوئی صاحب امیدوارِ سلام ہیں۔ میر انیس مرحوم نے ایک دوسری جانب رُخ پھیر کر فرمایا کہاں؟ دوسرے صاحب نے اشارہ کیا کہ اُس طرف ملاحظہ فرمائیے میر صاحب نے تیسری جانب رُخ پھیرا اور پھر فرمایا کہ کہاں ہیں وہ صاحب۔ آخر رئیس صاحب شرمندہ ہو کر بیٹھ گئے اور میر صاحب مسکراتے ہوئے نماز کو کھڑے ہو گئے ان رازوں سے جو لوگ ناواقف ہیں وہ ایک اخلاقی کمزوری بتائیں گے مگر ہم ان واقعات کو زیادہ توضیح سے بیان نہیں کر سکتے کیوں کہ موجودہ نسل کی دلشکنی کا خیال ہے۔

نقل

میرے والدِ مرحوم ہر مہینے کی سولھویں تاریخ ایک مجلس کرتے تھے اور اُس میں عجب قسم کا متضاد مجمع ہوتا تھا۔ فقط وہ نظارہ دیکھنے کے لئے لوگ مشتاق ہو کر آتے تھے یعنی میر انیس مرحوم اور مرزا صاحب مغفور اور میر عشق مبرور مع اپنے اپنے خاندانی ممبروں کے تشریف لاتے تھے اور راقم کے بزرگوں کے تعلقات و مراسم ان سب بزرگوں کو ایک جگہ جمع کر دیتے تھے کیا خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے یہ صحبتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ایسے مقدس اہلِ کمال کے دیدار سے فیض یاب ہوئے۔

نقل

شہر کے ایک رئیس زادے میر صاحب کے شاگرد تھے اور مرثیہ پڑھنے تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک روز حسبِ دستور مرثیہ کی مشق کر رہے تھے ایک مصرعہ کو میر انیس مرحوم

نے تین مرتبہ بتایا مگر نواب صاحب سے وہ انداز ادا نہ ہو سکا۔ میر صاحب نے مرثیہ ہاتھ سے چھین لیا اور فرمایا ایسے بے مغزوں کو مرثیہ پڑھنا نہیں آتا ہے، بے کار اپنا عیش کا وقت خراب کرتے ہو اور میرا دماغ پریشان ہوتا ہے۔ جاؤ اپنے باوا سے کہو کہ تمہیں اس عذاب سے چھڑائیں اور انیسؔ کے بڑھاپے پر رحم کریں۔ مصرع یہ تھا ؎

کھینچے جو کماں دے سنا ماں پیلِ دماں کو

اس مصرع کے وہ تینوں لفظ جن پر میں نے نشان کر دیا ہے ان پر زور دیتے تھے۔ اصولِ خوانندگی کے ساتھ ساتھ صنعتِ شاعری کا اظہار مقصود تھا۔ نواب صاحب کو بہ سببِ عدم مذاقِ شاعری مصرع کی صنعت کا لحاظ نہیں رہتا تھا تو پڑھنے کی ترکیب کیوں کر بآسانی ذہن نشین ہوتی۔ والدِ مرحوم فرماتے تھے کہ میر صاحب اس مسجّع مصرع کے مقفّٰی لفظوں پر زور دینے کے بعد ایک قلیل وقفہ دیتے تھے۔ وہ زمانہ نواب صاحب سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

نقل

ایک نواب صاحب میر انیس مرحوم کی خدمت میں مرثیہ کی مشق فرما رہے تھے اتفاق سے کھجانے کی ضرورت ہوئی۔ ضبط نہ کر سکے۔ دامن ہٹا کر پیٹ کھجانے لگے۔ میر صاحب نے کنکھیوں سے دیکھا اور خاموش ہو رہے مگر نواب صاحب کا کھجانے کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اب تو میر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا۔ رکھ دو مرثیہ اور پہلے اچھی طرح کھجا لو۔ مرثیہ پڑھنے سے اور اس بدتمیزی سے کیا علاقہ۔ نواب صاحب نے معافی چاہی میر صاحب نے فرمایا نہیں صاحب کھجائیے اور اچھی طرح کھجائیے۔ آپ نے مرثیہ کی تعلیم دھرپد اور ٹپہ کی تعلیم سمجھی ہے کہ گاتے بھی جاتے ہیں اور کھجاتے بھی جاتے ہیں۔

ایسے ایسے موقع ہیں جہاں میر انیسؔ مرحوم کی نازک مزاجی بدتہذیبی کی متحمل نہیں

ہوتی۔ وہ بڑے بااثر شخص تھے اُن کے غصے کے وقت بڑے بڑے صاحبِ اقتدار لوگ آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ اُن کی ایک ڈانٹ نے دو شالہ اوڑھنے والوں کو پائینِ فرش جوتوں کے پاس بٹھا دیا ہے۔ وہ منبر پر پہنچ کر اپنے جذباتِ غیظ کو روک نہیں سکتے تھے۔ اُن پر ایک عالمِ محویت طاری ہوتا تھا اور اُن کا نشۂ کمال اُن کو عالمِ قدس کی اُس بلندی پر پہنچا دیتا تھا جہاں سے اہلِ دُوَل کی شان نہایت پست دکھائی دیتی تھی۔

وہ چاہتے تھے کہ دورانِ مرثیہ خوانی میں کوئی صاحب آئیں تو جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائیں اور اکثر فرماتے تھے کہ اگر انیسؔ کے مشتاق ہوں گے تو پہلے سے تشریف لاکر کشمکش کی زحمت اُٹھائیں گے ورنہ صاحبِ خانہ اور بانیٔ مجلس کی خاطر سے آنے والے قدردانِ انیسؔ نہیں ہیں اور نہ انیسؔ کو اُن کے حفظِ مراتب کی ضرورت ہے۔

نقل

دورانِ مرثیہ خوانی میں ایک رئیس مجلس میں تشریف لائے اور چاہا کہ کسی طرح مجمع کو طے کر کے منبر کے قریب پہنچ جائیں۔ میر صاحب ارادہ سمجھ گئے اور اپنی رعب دار آواز سے فرمایا کہ بس وہیں بیٹھ جاؤ ایک قدم آگے نہ بڑھانا۔ رئیس صاحب نے وہیں غوطہ مارا اور جوتیوں کے پاس آرام سے بیٹھ گئے۔ یہ مقبولیتِ کلام اور شہرتِ کمال کا اثر تھا۔ اُن کے کلام کے مشتاق تین تین سو میل کا سفر کر کے مشہور مجلسوں میں شرکت کی غرض سے آتے تھے اور بعد ختمِ مجلس فوراً چلے جاتے تھے۔ اُن میں اکثر گورنمنٹ سروس میں تھے جو ملازمت کی وجہ سے پابندِ اوقات تھے۔ قدردانِ سخن میر انیسؔ کی بے اعتنائی کی پروا نہ کرتے تھے۔

غزل گوئی

میر انیس کا غزلیہ کلام صرف چند تذکروں میں نہایت مختصر پایا جاتا ہے اور اس میں بھی تواتر واقع ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ تذکرہ نے تیمّناً اور تبرکاً تلاش کی ہے۔ خود میر انیس نے اپنی غزلوں کی اشاعت کبھی نہیں چاہی اور نہ اپنا کلام کسی تذکرہ نویس کو دیا۔ تذکرۂ سراپا سخن ایک مبسوط تذکرہ ہے اور لکھنؤ کے ایک نامی شاعر محسن علی محسنؔ کی تالیف ہے۔ میر و سودا سے لے کر آتش و ناسخ کے دورِ آخر تک کے شعراء کا مجمع ہے مگر اس مجمع میں ہمارا ہیرو نہیں دکھائی دیتا یہاں تک کہ میر انیس کے دو بھائی انسؔ و مونسؔ بھی موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس کو اس عامیانہ شاعری سے نفرت ہو گئی تھی۔ اُن کے پروازِ ذہن کے لئے ایک کافی فضا کی ضرورت تھی اور اُن کے شاعرانہ خیالات تنگنائے غزل گوئی میں قید تھے جو مرثیہ کے غیر محدود دائرے میں گھبرا کر نکل آئے اور اس فضائے وسیع میں اُن کو مظاہرِ قدرت کے ایسے نُدرت خیز نظارے محسوس ہوئے جو متقدمین کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ اُنہوں نے ایک ایک کو چشمِ حقیقت نگر کا منظر بنا لیا۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ میر انیس مرحوم نے کبھی غزل نہیں کہی کیوں کہ غزل ہی بامِ شاعری کا پہلا زینہ ہے اور ابتداءً کل طبیعتوں کو تغزل ہی سے لگاؤ ہوتا ہے اور اس مشق سے انسان جملہ اصنافِ شاعری پر قدرت حاصل کرتا ہے۔ میر انیس مرحوم اس زینہ کے ذریعے سے شاعری کے بلند ترین منازل پر پہنچے مگر پھر ترقی پسند طبیعت نے پیچھے پلٹنا گوارا نہ کیا۔ اُن کے سامنے ایک ایسا راستہ تھا جس سے وہ مقاصدِ شاعری کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ گئے۔ عنفوانِ شباب کا زمانہ جو فیض آباد میں گذرا ہے اُس میں بڑے بڑے مطارحات کی نوبت آئی ہے چنانچہ میر علی حسن صاحب اشکؔ حیدر آبادی فرماتے تھے کہ اُن کا غزلیہ کلام ہمعصروں میں بڑی قدردانی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مگر میر انیس نے

اپنی اس صنعتِ شاعری پر اظہارِ فخر و مباہات نہیں کیا وہ اس معاملے میں بالکل خاموش تھے چنانچہ مرزا غالب مرحوم سے لکھنؤ میں جب میر انیس کی ملاقات ہوئی اور مرزا صاحب نے غزل سُننے کا شوق ظاہر کیا تو میر انیس مرحوم نے صنعتِ غزل گوئی کا ابتذال ظاہر کرکے اکثر سلاموں کے مطلع اور شعر سُنائے جو تغزل کے رنگ میں صنعتِ غزل سے بدرجہا بلند و مضمون خیز تھے اور مرزا صاحب سے دل لگی دل لگی میں مرثیہ کہنے کی فرمائش بھی کردی۔ میر انیس کا مقصود یہ تھا کہ غالب سا شاعر غالب بھی مرثیہ کی فکر کرکے دیکھ لے کہ یہ راستہ کس قدر دشوار گذار ہے چنانچہ مرزا غالب مرحوم نے صرف تین بند مرثیہ کے بڑی کاہش و کاوش سے لکھے ہیں اور میر صاحب کے پاس اصلاح کو روانہ کئے ہیں اور اُس کے ساتھ جو خط ہے اُس کی عبارت یہ ہے:۔

امتثالِ امر سے مجبور تھا صرف تین بند لکھ کر جو غور کیا تو مرثیہ کا ہیکل ہے واسوخت معلوم ہوتا ہے اصل بات تو یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا کام ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ غزل کا اصلی مقصود کیا ہے لُغت میں اس کے معنی ذکرِ معشوق و ذکرِ شباب کے آئے ہیں۔ شقِ اول مقدس شعرا کے لئے رکیک و مبتذل ہے جن کا کلام بازار کے سودے کی طرح فروخت نہیں ہوا اور نہ دولت کی طمع نے اُن کے استقلال کو جنبش دی۔ شقِ ثانی کو اُنہوں نے مرثیوں اور سلاموں میں بلند خیالی سے برتا ہے۔ غزل میں کیا چیز ہے جو سلاموں میں نہیں پائی جاتی۔ علمِ معانی و بیان کا تصرف حکیمانہ خیالات کے ساتھ ساتھ تشبیہہ و استعارات کی رنگینیوں سے کلام باغ و بہار ہو رہا ہے۔ واضع فن شاعری نے مفہوم غزل کی واقفیت کے لئے ایک کلیہ قائم کیا تھا (سخن بزنان گفتن) شاعری کی ترقی نے اُسے توڑ دیا اب تغزل کے اصلی معنی عامیانہ شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ فلسفیانہ شاعری کا مقصود مسائلِ حکمیہ ہیں جب ارسطو کا فلسفہ اور اُس کے محاکات دورِ آخر کی ترقی سے پامال ہو رہے ہیں اور تحقیقاتِ جدیدہ ایجاد و ترمیم میں مصروف ہے تو بنیادِ غزل کا کمزور کلیہ کس شمار میں تھا۔ یہ راستہ وہی اختیار کرے گا جس کا علم دائرۂ تحقیق میں محدود ہو اور فلسفہ و ادب کے علومِ متنوعہ کے ماہر مظاہرِ قدرت و

جذباتِ صحیحہ کو جولاں گاہِ شاعری بنائے ہوئے ہیں۔ اُن کا طائرِ خیال فضائے عالمِ بالا کے سوا پستی کی جانب رُخ نہیں کرتا۔

ہر صنعت کے شاعروں کو ماننا پڑے گا کہ میر انیس مرحوم کے آفتابِ کمال نے نصف النہارِ ترقی پر پہنچ کر ایسی تند و تیز شعاعیں زمین پر پھیلا دیں جن کے سامنے تمام اصنافِ سخن کی روشن شمعیں جھلملانے لگیں اس لیے ہم بھی اُن کی غزل گوئی سے قطع نظر کر کے صنفِ مرثیہ پر اپنی رائے ظاہر کریں گے اور جہاں تک ہماری معمولی لیاقتِ علمی کی رسائی ہو گی تنقید کی کوشش کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

تعدادِ مراثی

میر انیس کے مرثیوں کی تعداد کوئی بتا نہیں سکتا اور نہ وہ خود بتا سکے۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ ایک ہزار تک نوبت پہنچی ہے۔ جنابِ اشہری اپنی کتاب میں بحوالہ تذکرۂ آبِ حیات دس ہزار مرثیوں کی تعداد تحریر فرماتے ہیں اور اپنی ایک نظم مطبوعہ رسالہ مخزن میں ڈھائی لاکھ اشعار کی مقدارِ تصنیف لکھی ہے مگر میرے نزدیک یہ تحقیقات قابلِ اطمینان نہیں اور شاید کوئی شخص اسے قبول نہ کرے گا۔ میر انیس کی پچھتر برس کی عمر میں اگر ساٹھ سال مشقِ سخن کے لئے قرار دیئے جائیں اور ہر مہینے میں دو مرثیے تصنیف کرنے کا پیمانہ مقرر کیا جائے تو ساٹھ برس میں چودہ سو مرثیوں کے قریب تعدادِ تصنیف قرار پاتی ہے۔ سلام اور رباعیوں کا ذکر نہیں اور یہ اندازہ بالکل خلافِ قیاس ہے۔ میر انیس کو دس ہزار مرثیوں کا مصنف بتانا بالکل معجزہ یا کرامت کا ظاہر کرنا ہے کوئی انسان اس التزام سے اپنی حیات میں کسی کام کو انجام نہیں دے سکتا دنیا کے حوادث افرادِ انسانی کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ وجوب و مستحبات کو ترک کر دیں نہ کہ مشاغل و فرائضِ دنیوی! ایسے محققوں کی تحقیق کو میں الہامی تحقیقات کہتا ہوں جو طاقتِ بشری سے باہر

ہے اور اس دلیری پر افسوس کرتا ہوں۔ میری تحقیقات میں ایک نقل قابلِ بیان ہے جس سے میر انیس مرحوم کی تعدادِ تصنیف کا کچھ پتا چلتا ہے۔

نقل

میر سلامت علی صاحب لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے جن کو میر انیس مرحوم کا کلیات جمع کرنے کا شوق تھا اور انہوں نے اپنی تلاش سے میر انیس کا اکثر ایسا کلام بہم پہنچایا تھا جو خود میر انیس کے پاس نہ تھا۔ میرے والدِ مرحوم فرماتے تھے کہ ایک روز میں میر انیس کی خدمت میں حسبِ دستور حاضر تھا کہ میر سلامت علی صاحب آئے اور میر صاحب کی تصنیفات کا ذکر چھڑ گیا۔ میر انیس نے مسکرا کر دریافت کیا کہ کیوں صاحب میرا کلیات تو اب آپ نے جمع کر لیا ہوگا۔ میر سلامت علی صاحب نے عرض کیا کہ حتی الامکان تو میں نے کوششِ بلیغ کی ہے پھر میر انیس نے فرمایا کہ بھلا جنابِ عون و محمد کے حال کے کتنے مرثیے آپ کے پاس ہیں۔ میر سلامت علی صاحب نے مطلعے پڑھنا شروع کیے۔ دس پندرہ مطلعوں کے بعد میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ اچھا اب آپ خاموش رہیں میں مطلعے پڑھتا ہوں اور آپ اقرار کرتے جائیے۔ پھر میر انیس مرحوم نے مطلعے شروع کر دیئے۔ میر سلامت علی صاحب حیرت سے میر صاحب کا منہ دیکھ رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ یہ مرثیہ میرے پاس نہیں ہے۔ آخر میر انیس نے مسکرا کر فرمایا کہ بس اسی تحقیقات پر تمہیں فخر ہے۔ بھائی کس پھیر میں پڑے ہو۔ واللہ انیس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی تصنیف کی حد کیا ہے۔ پھر میرے والدِ مرحوم سے مخاطب ہو کر فرمایا میر حسن علی مجھے گمانِ واثق ہے کہ فیض آباد سے لکھنؤ تک میری تصنیف میں جنابِ عون و محمد کے حال کے مرثیے دو سو سے زائد ہوں گے کیوں کہ مجھے ابتدائے عمر سے اس حال سے دلچسپی رہی ہے اور میرے کلام کا معتد بہ حصہ اسی حال میں ہے۔

سبحان اللہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مرثیہ گویوں کو دس بیس مرثیے تمام کی عمر کی کائنات میں باعثِ فخر و مباہات ہوتے ہیں۔ وہ کیا لوگ تھے کہ جنھوں نے تصنیفات کے دریا بہا دیئے اور پھر اُس دریا کا کنارہ خود نہ بتا سکے۔ آج اگر کوئی شخص سوال کرے کہ وہ سب مرثیے کہاں ہیں تو اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔

کثرتِ تصنیفات سے اُن کے کلام کی حفاظت نہ ہوسکی۔ آمدِ طبیعت کا یہ حال تھا گویا ایک دریائے مواج لہریں مار رہا ہے۔ جس مرثیہ کو دیکھئے ہجوم مضامین سے مالامال ہے۔ طبیعت میں کسی جگہ عجز پیدا نہیں ہوتا۔ جس زور شور سے مطلع شروع کرتے ہیں اُسی قوت کے ساتھ مقطع تک پہنچا دیتے ہیں۔ بنظرِ غائر کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں پورا مرثیہ تمام کر دیا ہے۔ ضخامت دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن کسی مقام پر ٹھکتا نہیں۔ جس سلسلے کو اُٹھاتے ہیں رَو میں بیس بیس بند کہتے چلے جاتے ہیں۔ جتنا آگے بڑھتے ہیں نظم میں زور اور طبیعت کا جزر و مد بڑھتا جاتا ہے۔ ہر مرتبہ ثابت ہوتا ہے کہ گھوڑے یا تلوار کی تعریف میں بندِ آخر ہے۔ پھر اُس کے بعد دوسرا بند اِس زبردست قوت سے شروع ہو جاتا ہے کہ پہلے بند کے محاسن کو محو کر دیتا ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ اُن کے بہت حصہ ہائے نظم ناتمام بھی رہ گئے ہیں اور اکثر سے میر مونس مرحوم نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میر انیس کا دربارِ ناچوشی

زوجۂ میر ضمیر مرحوم کی تقریبِ چہلم میں میر انیس مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ روساء اور اکابرِ شہر کے علاوہ شعرائے کاملین کا بھی مجمع تھا۔ خواجہ حیدر علی آتش اور شیخ امام بخش ناسخ بھی موجود تھے۔ میر انیس کا یہ مرثیہ رنگ دے رہا تھا ؎

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی

تلوار کی تعریف میں جب اِس بیت کے پڑھنے کی نوبت آئی ؎

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے ۔۔۔ شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

تو خواجہ آتش کی جانب مخاطب ہوکر میر انیس نے کہا کہ اس بیت کی داد آپ سے چاہتا ہوں خواجہ آتش کی آزادی اور شوریدہ مزاجی مشہور ہے یہ پہلے سے جھوم رہے تھے اور عالمِ وجد طاری تھا۔ جب یہ بیت میر انیس نے پڑھی تو نصف قد سے کھڑے ہوگئے اور بآوازِ بلند کہا کہ کون بیوقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو۔ واللہ ثم باللہ تم شاعر گر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمہارے سر کے لئے موزوں بنایا گیا ہے۔ خدا مبارک کرے۔

نقل

آٹھویں محرم کو ایک مجلس میر انیس نواب علی نقی خان کے یہاں پڑھتے تھے۔ ایک روز حسبِ معمول مجلس شروع ہونے کا وقت آیا تو نواب صاحب نے وزیر خان چیلے کے ہاتھ میر انیس کو پیغام بھیجا کہ میں اس وقت دردِ سر کے سبب سے نہایت بے چین ہوں حاضریِ مجلس سے معاف فرمایا جاؤں میر صاحب نے جواب دیا کہ آج میرا مزاج بھی درست نہیں مناسب ہے جو مجلس موقوف رکھی جائے انشاء اللہ سالِ آئندہ دیکھا جائے گا۔ نواب صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے اور میر صاحب سے معافی مانگی اور اُسی تکلیفِ مرض میں آخر مجلس تک بیٹھے رہے۔

نقل

ایک مجلس میں میرے اُستاد مرحوم میر نفیس اعلی اللہ مقامہٗ اپنا نیا مرثیہ پڑھ رہے تھے اور سامعین میں کاملین کا مجمع تھا۔

آشفتہ گیسوئے دل آرام سخن ہوں

یہ مرثیہ رنگ دے رہا تھا۔ میر انیس زیر منبر تشریف رکھتے تھے فرزند رشید کے مضامین شاعرانہ کی داد دیتے جاتے تھے۔ انتہائے سرور سے جھوم رہے تھے۔ مجلس کے ایک گوشے میں چند شعرا آپس میں کچھ سرگوشیاں کرنے لگے۔ میر انیس کا خیال اہل مجلس کی جانب رجوع رہتا تھا ان کو یہ حرکت ناگوار گذری اور شبہ ہوا کہ کلام پر کچھ نکتہ چینی ہو رہی ہے آخر رگ ہاشمی کو حرکت پیدا ہوئی اور زانو ٹیک کر نصف قد سے کھڑے ہو گئے ان صاحبوں کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ گیارہ شعر کی غزل نہیں ہے جس میں کنگھی چوٹی کا ذکر کر کے دل خوش کر لیتے ہو۔ اس میدان میں شاعر قدم رکھے تو کلیجہ خون ہو کر بہہ جاتا ہے۔ وہ دن گئے کہ مرثیہ گوئی پر حقارت سے نظر ڈالی جاتی تھی۔ انیس نے اس صنف کو تمام اصناف سخن پر فوق دے دیا ہے۔ پھر صاحبزادے کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ خورشید علی میں نے تم سے سو مرتبہ کہا ہے کہ ایسے نالائقوں کے سامنے مرثیہ پڑھنا مضامین شاعرانہ کی توہین ہے۔ تم نے میرا کہنا نہ مانا اور آخر کو یہ خمیازہ کھینچنا پڑا۔ سبحان اللہ میر انیس کیا بااثر شخص تھے اور کیا خداداد دبدبہ رکھتے تھے کہ اتنا کچھ سن کر بھی اہل مجلس کی زبانیں بند ہو گئی تھیں اور آنکھیں نیچی تھیں، روسا و شرفا تالیف قلب میں مصروف تھے بے حد خوشامد و عاجزی سے اصلاح مزاج کی گئی تو فرزند رشید کی جانب پڑھنے کا اشارہ کیا۔ لکھنؤ میں چند شاعر ایسے بھی بیان کئے جاتے ہیں جو میر انیس پر در پردہ اعتراضوں کے حملے کرتے رہتے تھے اور اس مجلس میں انہیں کی جانب میر انیس کا روئے سخن تھا۔

نقل

آغا سید صاحب شرفائے لکھنؤ سے ایک شخص ہیں اور اب تک بفضلہ زندہ و سلامت ہیں۔ لکھنؤ کے محلہ منصور نگر میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کا ایک حیرت ناک واقعہ مشہور ہے۔

آغا صاحب کو میر انیس مرحوم سے کمال عقیدت تھی اور روز مرہ کی حاضری داخلِ وضع کرلی تھی۔ ایک روز دیرینہ حقوق پر بھروسا کرکے میر صاحب سے نئے مرثیے کے طالب ہوئے، بھلا میر انیس اور طلبِ مرثیہ۔ یہ دشوار امر تھا۔ میر صاحب نے کچھ روز بلطائف الحیل ٹالا آخر آغا صاحب کو یقین ہوگیا کہ کامیابی غیر ممکن ہے ناراض ہوگئے اور میر انیس کی خدمت میں آنا چھوڑ دیا۔ تھوڑے دن کے بعد خبر اُڑی کہ میر انیس کا فلاں نو تصنیف مرثیہ شائع ہوگیا۔ مشتاقوں نے میر انیس کی خدمت میں آکر دریافت کیا میر صاحب نے بالکل انکار فرمایا لوگوں نے مرثیہ لاکر دکھایا میر صاحب کو کمال حیرت ہوئی اور میر سلیس مرحوم پر شبہ گذرا کہ اُنھوں نے شائع کردیا ہے کیونکہ اُن کی آزادیاں اُس وقت قابلِ اعتراض تھیں، مگر جب یکے بعد دیگرے مرثیوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہوگیا تو میر انیس کو نہایت حیرت اور صدمہ ہوا مگر کسی طرح کوئی قابلِ اطمینان سراغ نہ ملا۔ ایک روز آغا سید صاحب خود میر صاحب کی خدمت میں آئے اور کہا کہ حضور ناحق بے گناہوں پر شبہ کرتے ہیں، یہ مجھ نالائق کا فعل ہے۔ میر صاحب نے کہا کہ صاحب آپ کو میرا نیا مرثیہ کیوں کر مِل جاتا ہے اور اگر مِل بھی جاتا ہے تو اس سے کیا فائدہ کہ آپ اس کو کوچہ بکوچہ شائع کردیتے ہیں۔ آغا صاحب نے عرض کیا کہ یہ ایک حیرت انگیز قصہ ہے اگر آپ یقین کریں تو میں بیان کروں میر صاحب نے فرمایا ضرور بیان کیجئے میں نہایت مشتاق ہوں آغا صاحب نے اپنا قصہ شروع کیا۔

جب حضور نے مجھے مرثیہ دینے سے انکار کیا تو مجھے نہایت صدمہ ہوا اُس شب کو میں بہت رویا اور اُسی حالتِ گریہ وزاری میں میری آنکھ لگ گئی تو میں نے دیکھا کہ ایک بزرگِ نقاب پوش میرے سرہانے کھڑے ہیں اور سببِ رنج وغم دریافت فرماتے ہیں اُس عالم میں بھی میری زبان سے یہی نکلا کہ جناب میر صاحب نے مرثیہ دینے سے انکار کیا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ تجھے میر انیس کے مرثیوں کا شوق ہے تو ہم تجھے دیتے ہیں، یہ کہہ کر اپنا دستِ مبارک میرے سینے پر پھیرا اور میری آنکھ کھُل گئی مگر مجھے سخت حیرت تھی کہ الٰہی یہ کیا خواب ہے

اور اس کی تعبیر کیا ہو گی کہ دفعتاً میرے دماغ پر اک روشنی پڑی اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے حافظے سے بہت بڑا کام لے سکتا ہوں اور برسوں کے نسیاً منسیا واقعات کی جانب سلسلۂ خیال دوڑنے لگا اُسی روز آپ کے پڑھنے کی ایک مجلس بھتی میں حاضر ہوا اور اپنے حافظے کے ذریعے سے تمام و کمال مرثیہ حفظ کر لیا اور اُس روز سے برابر یہ سلسلہ جاری ہے میر انیس کو جب اس رویائے صادقہ کی صداقت کا یقین ہو گیا تو گردن جھکا کر فرمایا کہ اِس معاملہ میں انیس مجبور ہے مگر میر انیس کی بے چینی سے متاثر ہو کر آغا صاحب نے اِس حرکت سے دست برداری اختیار کی اور میر انیس سے معافی مانگی۔

اس قصّے کو لوگ مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ ایک خوش اعتقاد آدمی کے سکوت کو اُس کا حُسنِ اعتقاد کافی ہے۔ مگر نئی روشنی کے تعلیم یافتہ نوجوان جن کا دماغ معقولات کا خزانہ بنا ہوا ہے وہ ذرا رنگ لائیں گے۔ یہاں بھی میری طبیعت بغیر استدلال نہیں رہ سکتی۔ مخلوقاتِ عالم میں انسانی ہستیاں نمایاں قدرتوں کی مالک ہیں۔ خلّاقِ عالم نے اپنی شانِ قدرت کا مظہر انسان ہی کو بنایا ہے۔ افرادِ انسانی سے فوق العادت بشری واقعات کا وقوع پذیر ہونا تسلیم ہے۔ گوشت کے لوتھڑوں اور خون کے سیّال مادہ سے بنا ہوا انسان علمِ نیر نجات کا نمونہ ہے۔ ارسطو کے اقوال میں موجود ہے کہ اس کا ایک شاگرد جو محض جاہل تھا کتبِ متداولۂ فلسفہ کا حافظ تھا۔ انسان کے دماغ کا ظرف اپنے اس مختصر پیمانہ کے خلا میں علومِ متنوعہ کے خزانے جمع کر سکتا ہے۔ دانشورانِ یونان کا قول ہے کہ انسان علمِ تسلسلِ خیالات کے ذریعے سے اپنے حافظے کو بڑھا سکتا ہے اور ایک خاص مشق سے جس کے اصول فلاسفہ نے اپنی تصنیفات میں قلمبند کئے ہیں انسانی یادداشت ترقی پذیر ہو سکتی ہے۔ قدرت نے انسان میں قوائے مودعہ یکساں تقسیم کئے ہیں۔ مگر ہر انسان اُن قوائے میں مقابلۃً ایک امتیازی شرف رکھتا ہے۔ کسی کی تخیل زبردست ہے تو کسی کا تصور قوی ہے۔ کسی کا ادراک و احساس مشرّف ہے تو کسی کا حافظہ ممتاز ہے۔ جو قوت انسان میں قوی الحس ہو اگر مشق کے ذریعے سے اس میں جلا کی جائے تو حیرت انگیز ترقی حاصل ہو

سکتی ہے اور اُس کی مثالیں کتبِ تاریخ و سیر میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔ ابوالفضل کے حالات میں یہ عجیب و غریب نقل موجود ہے کہ جو کوئی شاعر دربارِ اکبر میں قصیدہ پڑھتا تھا وہ ابوالفضل کو یاد ہو جاتا تھا اور مصنف کو شرمندہ کرنے کے لئے وہ دعوےٰ کرتا تھا کہ میرا کلام ہے اور پھر اپنے حافظے کے بھروسے پر سارا قصیدہ زبانی پڑھ کر سنا دیتا تھا۔ شاعر بے چارہ مجوب ہو کر دربار سے نکالا جاتا تھا۔ جب مرزا محمد علی صائبؔ ایران سے ہندوستان میں آئے اور بادشاہِ ہندوستان کے دربار میں قصیدہ خوانی کی نوبت آئی تو اُن کو پہلے سے اس حکمتِ عملی کی خبر ہو گئی تھی، قصیدہ شروع کیا اور ایک مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو گئے اور پھر حاضرین کی جانب مخاطب ہو کر کہا کہ اگر یہ قصیدہ کسی صاحب کا ہو تو مہربانی فرما کر دوسرا مصرعہ پڑھیں ورنہ اُن کے کمال کی قلعی کھل جائے گی مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ اس دربار میں حافظ بھی موجود ہیں جو دوسروں کا کلام یاد کر کے اُس کے مالک بن جاتے ہیں۔ اس صورت میں صائبؔ کو کامیابی ہوئی اور ابوالفضل کی چالاکی کا راز اہلِ دربار پر کھل گیا۔

یہ بھی قاعدہ ہے کہ مورخین ایسی نقلوں کو منافیِ عقل اور ناقابلِ قبول سمجھ کر واقعات سے خارج کر دیتے ہیں مگر یہ بہت بڑا تاریخی نقص ہے جو مورخ یا تذکرہ نویس کو مجرم ٹھہراتا ہے یہ کیا ضرورت ہے کہ جو واقعہ ہمارے نزدیک منافیِ عقل ہے ساری دنیا کے نزدیک ناقابلِ قبول سمجھا جائے۔ فرض کیجئے کہ ہمارا ذہن غلطی کرتا ہو تو اُس غلطی سے واقعاتِ تاریخی میں بہت بڑی فروگذاشت ہوتی ہے جو کتاب کو نامعتبر اور ناقابلِ پسند بناتی ہے یہاں مجھے ایک مثال یاد آ گئی جس پر اہلِ علم کی نگاہیں اُٹھ جائیں گی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں شہر خنسا میں پہنچ کر قاآنِ چین کے دربار میں جو تماشے دیکھے ہیں منجملہ اُس کے ایک نقل یوں بیان کرتا ہے۔

اُس رات شعبدہ باز بھی آئے وہ قاآن کے غلام تھے امیر نے اُن سے کہا کہ ہمیں کوئی عجیب تماشہ دکھاؤ اُن میں سے ایک شخص نے لکڑی کا گیند ہاتھ میں لیا اُس میں سوراخ تھے اور سوراخوں میں لمبے لمبے تسمے لٹکتے تھے۔ شعبدہ باز نے گیند کو آسمان کی طرف پھینکا۔ گیند نظر سے غائب

ہوگیا۔ ہم محل کے چوک میں کھڑے تھے گرمی کا موسم تھا۔ جب اُس کے ہاتھ میں تسمے تھوڑے سے باقی رہ گئے تو اُس نے اپنے ایک شاگرد کو اشارہ کیا وہ تسمے پکڑ کر لٹک گیا اور ہوا میں چڑھنے لگا اور نظروں سے غائب ہوگیا۔ پھر اُستاد نے شاگرد کو پکارا وہ نہ بولا تو اُستاد ایک چھُری ہاتھ میں لے کر اُن تسموں کے ذریعے سے اوپر چڑھ گیا اوپر سے پہلے شاگرد کا ایک ہاتھ کٹ کر گرا اور پھر دوسرے اعضاء یہاں تک کہ سر اور دھڑ بھی مقتول کا زمین پر گرا۔ اُستاد پہلے نیچے اُترا اور نتھنوں سے پھنکارے مارتا تھا کپڑے خون میں لتھڑے تھے۔ اُس نے بادشاہ کے سامنے زمین کو بوسہ دیا۔ امیر نے اُسے انعام کا حکم دیا۔ پھر اُس نے اُن بُریدہ اعضا کو جوڑ کر مُردہ انسان کو زندہ کر دیا۔

یہ نقل سفر نامۂ ابن بطوطہ[1] میں موجود ہے اور اِس تماشے کی تصدیق مختلف ذرائع سے ہوتی ہے۔ ایڈورڈ ملٹن ۱۶۷۰ء میں ذکر کرتا ہے کہ ملک جاوا میں اس کے سامنے ایسا تماشہ دکھایا گیا اور سیر المتاخرین کے مصنف نے بھی اپنی کتاب کی جلد اوّل صفحہ (۲۴۳) میں یہ واقعہ درج کیا ہے۔

تزکِ جہانگیری میں بادشاہ جہانگیر اپنی آنکھ سے اس واقعہ کو دیکھا ہوا بیان کرتا ہے اور اُس کی قوتِ مشاہدہ مسلّمہ ہے اور یہ امر ثقات میں مان لیا گیا ہے کہ جہانگیر میں مبالغہ کی عادت نہیں۔ اب مترجم سفر نامہ نے جو اپنی تالیف پر حاشیہ چڑھایا ہے اُس میں صاف طور پر لکھ دیا ہے۔ مجھے جو تزکِ جہانگیری کا نسخہ ملا وہ اتفاقاً علیگڈھ کا چھپا ہوا تھا اور اس لئے مجھے یہ عبارت سیر المتاخرین سے لینا پڑی۔ تزکِ جہانگیری مطبوعہ علی گڈھ کے نسخہ سے سیّد احمد خان صاحب نے یہ مقام نکال ڈالا ہے۔ کسی غیر کی کتاب میں یہ تصرف ہر طرح مذموم ہے۔ ایڈیٹر یا محشی یا نقل کرنے والے فقط اس قدر کر سکتے ہیں جیسا سیر المتاخرین کے مصنف نے یہ تماشہ نقل

---

[1] دیکھو سفر نامۂ ابن بطوطہ مترجمہ خان بہادر مولوی محمد حسین ایم اے۔ جلد دوم صفحہ ۲۱۴

کر کے لکھ دیا ہے: "فقیر از کتابیکہ انتساخ نمودہ چنیں نوشتہ اندا گرچہ مقول بنیت والعہدۃ علی الراوی"۔ غالباً سید صاحب کو اس بے جا تصرف پر اس بات نے آمادہ کیا ہوگا کہ بازیگروں کے ایسے تماشے دکھانا اُن کے کرامات و معجزات کے انکار کو ضعف پہنچاتا ہے۔ جب ہم سچے واقعات لکھنے کے پابند ہیں تو تحریف و ترمیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ امر مورّخوں کے فرائض کے خلاف ہے چنانچہ جناب اشہری نے بھی اس معاملہ میں شانِ تاریخ نویسی کو قائم نہیں رکھا اور میر انیس کی سوانح عمری لکھنے میں نہایت مبادرت کی ہے۔ میری کتاب سے مقابلہ کرنے کے وقت یہ راز کھل جائے گا ع

ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

مورّخ کے لئے صرف اتنی احتیاط کافی ہے کہ تحقیق راویانِ ثقات سے اور اقتباس کتبِ معتبرہ سے کیا جائے اور لیں۔

جنابِ اشہری نے اپنی کتاب کو بے جا طول دیا ہے اور اس اطنابِ کلام نے کتاب کے ذاتی مطالب پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی ہے۔ مختلف اہلِ قلم کی تصنیفات سے مختلف مضامین کا اقتباس کر کے کتاب کے صفحے کے صفحے رنگ ڈالے ہیں۔ یہاں تک کہ مفتی میر عباس صاحب شوستری اعلی اللہ مقامہٗ کا قصیدہ جس کو مطالبِ کتاب سے کوئی غرض نہیں کھینچ تان کر اُس کا تعلق بھی کتاب سے پیدا کیا گیا ہے۔

اندازِ ہنگامِ تصنیف

میر انیس جب کچھ تصنیف کرنا چاہتے تھے تو اس وقت کا اُن کا انداز بھی سب سے نرالا بیان کیا جاتا ہے۔ وہ بستر پر دراز ہو جاتے تھے اور ایک چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ لیتے تھے اور مُنہ بھی اُس چادر کے اندر ہوتا تھا۔ ایک ہاتھ خم کر کے اُس کی کلائی آنکھوں پر رکھ

لیتے تھے اور شغل جاری ہو جاتا تھا اِس صورت میں کاتب کوئی دوسرا شخص ہوتا تھا اور اس خدمت کا شرف میرے اُستادِ مرحوم کو اکثر حاصل ہوا ہے۔

نقل

مشہور ہے کہ میر انیس مرحوم نے آخر زمانہ میں ایک مدتِ دراز تک مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے اسباب واقفانِ راز مختلف بیان کرتے ہیں۔ اول یہ کہ فرزندِ رشید میں قابلیتِ تصنیف و خواندگی پیدا ہو گئی تھی اور ایسا ہی میر خلیق نے بھی کیا تھا کہ جب میر انیس مرحوم تیار ہوئے تو جنابِ خلیق عزلت نشین ہو گئے۔ دوسرا سبب یہ بھی سنا جاتا ہے کہ جب میر انیس نے پٹنے کے سفر کا ارادہ کیا تو تُو سارا شہر نے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میر انیس کے کلام اور اُن کے کمال سے دُنیا کا ہر ہر گوشہ فیض یاب ہو مگر میر انیس اس امر کو کم ہمتی اور ناقدری پر محمول کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ شکایت نمایاں طور پر کبھی نہیں کی گئی مگر دلی خیال ظاہر کیا جاتا ہے بہر کیف جو کچھ ہو مگر کئی سال تک اس کی پابندی رہی اور بڑے بڑے صاحبِ اقتدار حضرات نے زور ڈالا لیکن میر صاحب انکار ہی کرتے رہے۔ آٹھ دس برس کے بعد پھر میر انیس نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا ہے اس کے بھی دو سبب بیان کئے جاتے ہیں۔ میرے والدِ مرحوم فرماتے تھے نواب غضنفر الدولہ مرحوم نے جناب قبلہ و کعبہ سید تقی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ سے سفارش چاہی اور قبلہ و کعبہ نے میر صاحب کو مجبور کر کے آمادہ کیا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ محمد مرزا صاحب اُنس اور جنابِ عشق مرحوم نے جناب گلشن[لہ] صاحب کو آمادہ کیا وہ اپنے نانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے منت مانی تھی کہ حضور کو صحت ہو گی تو ایک

لہ جناب گلشن صاحب جناب پیارے صاحب رشید کے بھائی اور میر انیس مرحوم کے نواسے ہیں۔

مجلس کروں گا اور حضور ہی کو پڑھواؤں گا۔ شاید اس زمانے میں میر انیس کی طبیعت کچھ ناساز ہوگئی تھی اور اُن کی صحت پر یہ مشورہ مشاقوں میں طے ہو چکا تھا۔ جب میر صاحب صحیح و تندرست ہوئے تو کلن صاحب اپنے نانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ کیفیت بیان کی۔ میر صاحب نے بہت غصّہ کیا اور فرمایا کہ اگر تم نے میری صحت کی مجلس مانی ہے تو مجلس کرو۔ میرے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر میں میر انیس مرحوم اپنے نورِ چشم کی ضد اور ہٹ سے مجبور ہو گئے اور اقرار کر لیا۔ اُس وقت تک کئی سال کے ترک کے بعد جو مرثیہ میر انیس نے امام باڑہ افضل محل مرحومہ واقع ڈیوڑھی آغا میر میں پڑھا ہے اُس کا مطلع یہ ہے ؎

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس مرثیہ کا قریب قریب نصف حصّہ میر انیس نے ایک شب میں تصنیف فرمایا ہے۔ مضامینِ شاعرانہ کے ساتھ ساتھ فکرِ بدیہی و معجل کی بھی شہرت ہوئی۔ اور یہ ذکر نواب محمد حسین خان صاحب کی صحبت میں بھی آیا۔ اُس وقت میر نواب صاحب مونس بھی اُس صحبت میں تشریف رکھتے تھے۔ میر مونس نے فرمایا کہ مشاقوں کے نزدیک ایک شب میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا کچھ حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ غمازوں نے یہ فقرہ میر انیس کے کان تک بھی پہنچا دیا۔ خدا جانے کس عنوان سے اس قصّہ کو بیان کیا کہ میر انیس کو چھوٹے بھائی کی طرف سے کسی قدر ملال پیدا ہو گیا۔ نواب میر محمد حسین خان صاحب کی سالانہ مقررہ مجلس کے لئے میر مونس نے نیا مرثیہ کہا اور میر انیس مرحوم کی خدمت میں بغرضِ اصلاح حاضر ہوئے اُس وقت میر انیس دیوان خانہ کے حوض میں غسل فرما رہے تھے گرمی کی فصل تھی اور ارادت مندوں کا مجمع تھا۔ میر مونس تسلیم کر کے بیٹھ گئے۔ میر انیس نے فرمایا کیوں میر نواب اس وقت کہاں آئے، عرض کیا کہ اصلاح کے لئے حاضر ہوا ہوں مجلس کا زمانہ قریب ہے۔ مسکرائے اور فرمایا اچھا تم مرثیہ پڑھو میں سنتا ہوں۔ میر مونس نے مرثیہ شروع کر دیا۔ میر انیس غسل کرتے جاتے

تھے۔ کلائیوں کو مَل رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پچیس تیس بند مسلسل سُننے کے بعد فرمایا لاؤ مرثیہ مجھے دو۔ میر مونس نے ہاتھ بڑھا کر مرثیہ دے دیا۔ میر انیس نے مرثیہ کو دو تین مرتبہ حوض میں غوطہ دے کر انگھی کے اندر چھوڑ دیا اور فرمایا کہ اس مرثیہ میں ہے کیا جسے اتنی بڑی مجلس میں پڑھنے کا ارادہ کیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ کیا دماغ پریشان ہوا ہے۔ یہ کہہ کر حوض سے باہر تشریف لائے اور زنانہ مکان میں چلے گئے۔ میر مونس سکتے میں بیٹھے رہ گئے۔ کچھ تصنیف کے ضائع ہونے کا ملال اور کچھ بڑے بھائی کی ملامت کا اثر۔ غرض عجب مخمصہ تھا کہ قابلِ بیان نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میر ابو محمد صاحب کھیلتے ہوئے گھر سے باہر آئے۔ میر مونس صاحب کو دیکھ کر کہا چھوٹے دادا مزاج کیسا ہے۔ میر مونس نے جواب دیا بیٹے چھوٹے دادا مر گئے وہ ہیں کہاں۔ میر ابو صاحب اس اشارے کو نہ سمجھے کیوں کہ وہ اُس وقت کم عمر تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میر محمد صاحب سلیس باہر تشریف لائے اور کہا چھوٹے عمو چلیے باواجان بُلاتے ہیں۔ میر مونس مکان میں تشریف لے گئے۔ دسترخوان بچھا ہوا تھا اور میر انیس مرحوم اپنے چھوٹے بھائی کا انتظار کر رہے تھے۔ میر مونس سے فرمایا میں جانتا ہوں کہ مرثیہ کا غم تمہیں بہت ہے مگر خیر آؤ کھانا تو کھالو۔ میر مونس تعمیلِ حکم میں مصروف ہو گئے۔ میر انیس

ﻟﮧ میر ابو محمد صاحب عرف میر ابو صاحب میر محمد سلیس مرحوم کے صاحبزادے اور میر انیس مغفور کے پوتے ہیں۔ ان کو کمسنی سے دادا نے پالا اور انہیں کے پاس رہتے تھے۔ میر انیس مرحوم ان کو بہت چاہتے تھے اور اُس محبت کا اثر چالیس برس کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ دفعتہً ان کے کمال نے شہرت حاصل کی۔ ابھی صرف تین چار برس کا عرصہ گزرا ہے کہ ان کی تصنیف نے اہلِ شہر کو اپنی جانب مخاطب کر لیا اور اہلِ علم کی نگاہیں ان کے کمال کی طرف دفعتہً اُٹھ گئیں اور خدا کے فضل سے حیرت انگیز ترقی کی۔ مرثیہ میں اپنے دادا کی زبان کے جوہر دکھا دیئے۔ یہ صاحب یادگارِ خاندان میر انیس ہیں۔ جس زمانے کا ہم نے ذکر کیا ہے اُس وقت یہ بہت کم عمر تھے۔

مسکراتے جاتے تھے اور مونس سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کوئی پہلو تقریر کا پیدا کر کے فرمانے لگے۔ بھائی اتنا غم کیوں کرتے ہو۔ ماشاء اللہ جوان آدمی ہو۔ کیا بڑی بات ہے مجلس کو کئی روز باقی ہیں دوسرا مرثیہ کہہ لو۔ میر مونس نے عرض کیا کہ حضور خوب جانتے ہیں کہ مجھ میں اس قدر قوتِ شاعری نہیں۔ میر انیس نے فرمایا کہ پھر کس بھروسے پر کہہ دیا تھا کہ سو پچاس بند ایک وقت میں کہہ لینا کچھ بڑی بات نہیں۔ میر مونس کو اپنا قول یاد آیا اور نہایت محجوب ہوئے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا واللہ باللہ جو یہ بات میں نے کسی خاص ارادے سے کہی ہو۔ نواب میر محمد حسین خان صاحب کی صحبت میں علی سبیلِ تذکرہ میری زبان سے نکل گیا تھا خدا کے لئے معاف فرمایئے بڑے بھتیا میں تو آپ کا خادم ہوں۔ میری جانب سے ایسی بدگمانی۔ میر انیس نے فرمایا کہ یاد رکھنا اگر تمہاری تعلّیوں کی یہی کیفیت رہی تو خورشید علی کی جوتیاں ہوں گی اور تمہارا سر۔

سعادت مند بھائی نے گردن جھکالی اور میر انیس مرحوم نے سینے سے لگالیا۔ کھانے سے فراغت کرنے کے بعد میر صاحب پلنگ پر تشریف لے گئے۔ ایک بھائی اور دو فرزندوں کو حکم ہوا کہ پلنگ کے قریب کرسیوں پر بیٹھیں۔ چو بندہ مسطر کشیدہ کاغذ ہر ایک کے ہاتھ میں دیا گیا اور سلسلۂ تصنیف شروع ہوگیا۔ اس طرح پر جو مرثیہ تصنیف کیا گیا ہے اُس کا مطلع یہ ہے ع

مجلس افروز ہے مذکورِ وفاداریِ حُر

اس مرثیہ کو میرے اُستادِ مرحوم سے بہت تعلق ہے۔ قرادت کے متعلق جس قدر بند ہیں وہ تمام و کمال میر نفیس مرحوم کے ہیں باقی میر انیس مرحوم اور میر مونس کا بھی ذاتی کلام ہے۔ بہر کیف اس انتظام سے یہ مرثیہ ایک شب میں تصنیف کیا گیا ہے۔

لطیفہ

نواب زُبدۃ الدولہ بہادر مجھ سے فرماتے تھے کہ میں ایک روز لکھنؤ سے کلکتہ آتا تھا اور

اُس وقت تک اودھ روہیل کھنڈ ریلوے جاری نہ ہوئی تھی کلکتہ اور پٹنہ کے جانے والے لکھنؤ سے گھوڑوں کی ڈاک پر پہلے کانپور جاتے تھے اور کانپور سے براہِ ریل الہ آباد تک اور الہ آباد سے گھوڑوں کی ڈاک پر مغل سرا اور مغل سرا سے پھر ریلوے لائن مل جاتی تھی۔ چنانچہ میں کانپور پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میر انیس مرحوم اور میر مونس مغفور اسٹیشن پر تشریف رکھتے ہیں۔ میر مونس کی خدمت میں مجھے اچھی طرح نیاز حاصل تھا اور میر انیس مرحوم مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ میر نواب صاحب مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے اور پوچھا کہاں جاتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ کلکتہ۔ فرمایا خوب ملاقات ہو گئی۔ چلو پٹنہ تک ساتھ رہے گا۔ بڑے بھیّا عظیم آباد تشریف لئے جاتے ہیں۔ میر انیس مرحوم نے میر نواب صاحب سے پوچھا میر نواب یہ کون صاحب ہیں۔ میر نواب نے عرض کیا کہ جنرل ذوالفقار الدولہ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کا نام میر سیّد محمد اور خطاب زبدۃ الدولہ ہے۔[1] میر صاحب مسکرائے اور کہا جب ہی مُرغِ زرّیں بنے ہوئے ہیں صاحب بادشاہی متوسلین سے ہیں۔ سیّد محمد صاحب فرماتے تھے کہ میں اس وقت ایک چینی اطلس کا لبادہ پہنے تھا جس کا ریشم دھوپ کے عکس سے چمک رہا تھا۔ اس مناسبت سے میر انیس نے یہ پھبتی اُڑائی تھی۔ آخر سوار ہوئے ریل پر مختلف ذکر رہے اور میر صاحب کے اصرار سے مجھے پٹنہ میں قیام کرنا پڑا۔ بعدِ ختمِ مجلس تیسرے روز کلکتہ روانہ ہوا۔

---

[1] زبدۃ الدولہ عرف میر سیّد محمد صاحب رسالدار خلف جنرل ذوالفقار الدولہ برادرِ سلطان کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ راقم الحروف جب اپنی ملازمت کے سبب سے کلکتہ میں قیام پذیر تھا اُس وقت اکثر تشریف لاتے تھے اور الطاف بزرگانہ فرماتے تھے۔ ایک خوش مزاج زندہ دل شخص ہیں اور ہر دلعزیز ہیں۔ دورِ شاہی کے اکابر میں یادگار ہیں۔ دام ظلہٗ العالی۔

لطیفہ

میر انیس مرحوم تپ میں مبتلا تھے جناب مفتی میر عباس اعلی اللہ مقامہٗ عیادت کو تشریف لائے، نبض دیکھ کر فرمایا کہ اب تو بخار خفیف ہوگیا ہے۔ میر انیس مرحوم نے فرمایا اک مشتِ استخوان کی ناتوانی دیکھ کر ایسا خفیف ہوا ہے کہ شاید اب کمبخت منہ نہ دکھلائے گا۔

لطیفہ

ایک ملازم کو کسی کام کو بھیجا واپس آنے میں دیر ہوئی میر صاحب مرحوم غصے میں بھرے بیٹھے تھے کہ ملازم واپس آیا۔ میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ کہاں مرگیا تھا۔ نوکر نے ایک عجیب وغریب قصہ شروع کیا یعنی چوک سے ایک برات جاتی تھی اُس کے دو اونٹ آپس میں لڑ رہے تھے۔ راستہ بند تھا راہگیر ایک جانب سے دوسری جانب عبور نہیں کرسکتے تھے۔ میر صاحب مسکرائے اور فرمایا تو صاف کیوں نہیں کہتے کہ جنگِ جمل کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

مفتی میر عباس مغفور اور جنابِ انیس میں شکر رنجی

قبلہ وکعبہ مفتی میر عباس صاحب شوستری اور جنابِ انیس مرحوم میں محبتِ قلبی تھی کسی بات پر کچھ بدمزگی واقع ہوئی۔ اُس حالت میں جناب مفتی میر عباس صاحب نے ایک رُقعہ میر انیس کے پاس روانہ کیا۔ انیس مرحوم نے لفافۂ خط پر یہ شعر لکھ دیا۔

مرنجاں دلم را کہ ایں مُرغِ وحشی زبامیکہ برخاست مشکل نشیند

مفتی صاحب نے ایک پورا قطعہ اِس زمین میں لکھ کر میر صاحب کے پاس روانہ کیا ہے جس سے مفتی صاحب کی محبت کا راز ظاہر ہو رہا ہے۔ میں چند شعر اُس قطعہ کے ناظرین کی دلچسپی کے لئے لکھے دیتا ہوں۔

وھو ھٰذا

توشتی کہ دلِ ہست چوں مُرغِ وحشی — زبا میکہ بر خاست مشکل نشیند
تو اے گل نئی مرغ وحشی انیسی — چہ باشد کہ گل با عنادل نشیند
تو فرزندِ مشکل کشائی پس ایں مُرغ — ہم آساں نشیند نہ مشکل نشیند
دلت بود جائے من ونیست باور — کہ بر جائے من کینہ در دل نشیند
تو گفتی میا راز دل را کہ ایں مرغ — زبا میکہ بر خاست مشکل نشیند
سرت گردم[1] آزارِ عاشق چہ باشد — بجز ایں کہ بر در چو سائل نشیند
دگر از درِ خود جدا اُش نشانی — بمحرابِ کوئے تو مائل نشیند
زخشمِ تو میگریم و چشم دارم — بشوید غبارے کہ در دل نشیند
بجز آہ و افغاں زِ مجنوں چہ خیزد — وزاں دم کہ لیلےٰ بہ محمل نشیند
خیالِ تو با ماست خواہی نخواہی — زبیروں چو بر خاست داخل نشیند
لبا حیرت از زنگ کز ناقصی چند — بر آئینہ عقلِ کامل نشیند
چو پیدا شود حق نماند نشانے — ز نقشے کہ بر فردِ باطل نشیند
تو با بندہ بنشین و بگذار دل را — زما دور تا صدر مراحل نشیند
امیر است کاندر جہاں بر اراکک — بنزدیکم او نیز بے رغل نشیند

---

[1] اس خطاب سے انتہائے غلبۂ محبت مترشح ہے اور ایسے مخصوصین کے قلم سے نکلے ہوئے لفظ میرانیس کی عظمت و وقعت دکھاتے ہیں۔

ملی را نگہ کن کہ از ابنِ ملجم | پس از آں کہ گردیدہ بسمل نشیند
بقاتل بگوید سخن با مدارا | ز روئے عدالت مقابل نشیند
دہد کاسۂ شیر ہرگز نخواہد | کہ در قید لب تشنہ قاتل نشیند
بدہ شربتِ وصل ما خاکیاں را | کزاں آتشِ شوق در گل نشیند
ترا غرجگر گر شدہ مرتقائی | نباید محب تو بیدل نشیند
ز فضل و کمالِ تو بر خاست شورے | چرا کینہ با ایں فضائل نشیند
سر نکے نہ ریزد فغانے نہ خیزد | اگر بے تو صدکس بہ محفل نشیند
کہ بے خسرو ملکِ شیریں بیانی | ترِ شیشہ زہر بلاہل نشیند
سخن مختصر ایں کہ ایرانیاں را | نباید چنیں کینہ در دل نشیند

تو چوں بحر در جوش لب تشنہ سیّد
بدریا رود یا بہ ساحل نشیند

نقل

نواب مبارک محل مرحومہ نے نجفِ مبارک واقع لکھنؤ کے متعلق جو وثیقہ مقرر کیا اُس میں چالیس روپیہ ماہوار نسلاً بعد نسلٍ میر انیس کا بھی تھا اور سال میں ایک مجلس میر انیس مرحوم وہاں پڑھا کرتے تھے اور اِس وثیقہ کی تقسیم متولیانہ طور پر حکیم بندہ مہدی خاں مرحوم سے متعلق تھی۔ جب مجالسِ مقررہ میں عامیانہ مجمع ہونے لگا تو میر صاحب نے اُس مجلس میں خود پڑھنا چھوڑ دیا۔ اب کسی صاحبزادے کو بھیج دیتے تھے۔ یہ بات متولی صاحب کو ناگوار ہوئی۔ ایک مجلس کا اشتہار جاری کیا اور میر انیس مرحوم کی خوانندگی سے اُس مجلس کو نامزد کیا مگر انیس مرحوم کو کوئی خاص طور پر اطلاع نہیں کی گئی۔ عین وقت پر میر انیس کی خدمت میں سواری بھیجی گئی۔ میر صاحب نے

جانے سے انکار کیا، متولی صاحب کے خلاف مزاج ہوا اور رقمِ وثیقہ موقوف کر دی۔ میر انیسؔ نے کچھ پروا نہ کی اور نہ کوئی شکایت، بلکہ اکثر صاحبوں نے جو میر صاحب سے اس کا ذکر کیا تو جواب دیا کہ انیس کی جوتی کا ایک ستارہ گر گیا۔ ایک مدت کے بعد حکیم بندہ مہدی خان صاحب اپنی اس حرکت سے نادم ہوئے اور نواب اہتمام الدولہ کو میر انیس کی خدمت میں بھیج کر اپنے معاملے کی صفائی چاہی اور معافی مانگی۔ میر صاحب نے فرمایا مجھے کوئی شکایت حکیم صاحب سے نہیں ہے۔ اگر وہ ماہواری وثیقہ کو جاری کرنا چاہتے ہیں تو من ابتدائے موقوفی تا تاریخِ اجرا پہلے چڑھی ہوئی رقم بھیج دیں۔ اُس کے بعد تنخواہ جاری ہو جائے۔ چونکہ رقم معتد بہ ہوتی تھی لہٰذا یہ صورتِ معاملہ حکیم صاحب کو پسند نہ آئی اور خاموش ہو رہے۔ اُس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد حکیم محمد رضا خان مرحوم متولیِ نجفِ مبارک ہوئے۔ اُنہوں نے بھی عالیجناب مرزا محمد عباس علی خان بہادر کے ذریعے سے تنخواہِ سابق کو جاری کرنا چاہا۔ میر انیس مرحوم انتقال کر چکے تھے اور میر نفیس متوفی موجود تھے۔ مرزا صاحب موصوف نے میر نفیس کی خدمت میں حکیم صاحب کا پیغام پیش کیا۔ میر نفیس مرحوم نے بھی وہی جواب دیا کہ اُس وقت سے اِس وقت تک اگر کل رقم ادا کی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اب یہ معاملہ بہت اہم ہو گیا تھا آخر کچھ بھی نہ ہو سکا۔ البتہ مرزا محمد جعفر صاحب اوجؔ نے اپنے والد کے بعد اپنے موروثی حقوق اماماڑہ میر باقر سوداگر سے جو کچھ معین تھے بچارہ جرئی عدالت وصول کر لیے اور استحقاق دکھا دیا۔

نقل

جنابِ میرن صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ میں نے بنارس کی ایک مجلس میں اس خاندان کے پانچ صاحبوں کو ایک ہی وقت میں سُنا ہے۔ پٹنہ سے واپسی کا موقع تھا۔ حسبِ وعدہ

بنارس میں ایک مجلس پڑھنے کے لیے میر انیس نے ایک، روز قیام فرمایا تھا۔ یہ مجلس قاضی میر یار علی صاحب کے امام باڑہ واقع تیلیا نالے میں منعقد ہوئی تھی اور اُس وقت یہ پانچ بزرگوار رونقِ محفل تھے۔ میر انیس مرحوم، میر انس مرحوم، میر رئس مغفور، میر نفیس مبرور، میر وحید مرحوم۔ پہلے میر وحید صاحب نے پیش خوانی کی، پھر میر نفیس پھر جناب مونس اور پھر میر مہر علی صاحب انس۔ چونکہ یہ برابر کے بھائی تھے اور فنِ مرثیہ گوئی کی بابت ناز و انداز برادرانہ رکھتے تھے، مقتضائے وقت نے مجبور کیا کہ کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں اور ایسا ہی ہوا مرثیہ نے خوب رنگ دیا اور آخر میں گریہ بھی بے حد ہوا جب میر انیس مرحوم سے صاحبِ خانہ نے درخواست کی تو میر صاحب نے عذر کیا اور فرمایا کہ تا اِل مجلس ہو چکا میر انس ماشاء اللہ خوب پڑھے۔ اب میری کچھ ضرورت نہیں ہے مگر صاحبِ خانہ نے دست بستہ عرض کیا کہ یہ سب لوگ حضور ہی کے مشتاق ہیں۔ اِن کو اس سعادت سے محروم نہ رکھئے۔ آخر میر صاحب مجبور ہو گئے اور فرمایا لوگ نہایت کسلمند و رختہ ہیں حوائجِ ضروری سے فراغت کریں اور حقّے کا دور شروع کیجئے۔ نصف گھنٹہ کا وقفہ دے کر میر صاحب منبر پر تشریف لے گئے اور پھر ایسا پڑھے کہ اہلِ مجلس گذشتہ واقعات کو بالکل بھول گئے۔ یہ نقل زبانی میرن صاحب[1] لکھی گئی ہے۔

نقل

لکھنؤ کے مشہور شاعر شیخ امداد علی بحرؔ میر انیس کی خدمت میں اکثر تشریف لایا کرتے

---

[1] سیّد مصطفےٰ علی خان عرف میرن صاحب خلف تکریم الدولہ نواب اصغر علی خان نبیرۂ اکرام الدولہ مرزا حسین خان و یمین الدولہ مرزا علی خان ہمشیرہ زادۂ محمد وجد علی شاہ اودھ بنارس کے محلہ درگا کنڈ میں تشریف رکھتے ہیں۔ راقم سے کلکتہ میں پرنس مرزا رضا علی بہادر عرف۔ سلطان مرزا صاحب کے مکان پر ۱۹۰۲ء میں نیاز حاصل ہوا تھا۔

تھے اور اپنا کلام سُنایا کرتے تھے۔ چونکہ میر انیس کو غزل گوئی سے تعلق نہ تھا اس وجہ سے داد دینے میں کم توجہی فرماتے تھے۔ ایک روز ایک مطلع میر صاحب کے سامنے پڑھا جس کی شہرت مشاعرہ میں ہوئی تھی اور اُمیدوارِ داد ہوئے۔ میر صاحب سُن کر خاموش ہو رہے۔ شیخ صاحب نے دوبارہ داد چاہی۔ میر صاحب کو اُن کی اس حرکت سے غصہ آگیا اور فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا۔ اِس مطلع کی تعریف اہلِ مشاعرہ نے کیا سمجھ کر کی ہے۔ اس میں تو ایک ترکیب خلافِ محاورہ واقع ہوئی ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

حُور بن کر ترے کُشتے کی قضا آتی ہے

دامنِ تیغ سے جنّت کی ہوا آتی ہے

میر صاحب کا اعتراض تھا کہ دامنِ تیغ خلافِ محاورہ ہے بلکہ دامنِ شمشیر چاہیئے۔ شیخ صاحب نے کلامِ اعجام کی بہت کچھ ورق گردانی کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ شیخ صاحب میر صاحب سے اکثر یہ بھی کہا کرتے تھے کہ حضور میرا دیوان ایک مرتبہ ملاحظہ فرما کر اصلاح سے مزین فرما دیں تو مجھے اطمینان ہو۔ والد مرحوم فرماتے تھے کہ میر صاحب ٹال دیا کرتے تھے اور جب شیخ صاحب چلے جاتے تھے تو میر صاحب اکثر فرماتے تھے کہ واللہ جو اس شخص کی شاعری میری سمجھ میں آتی ہو۔ کچھ عجب مہمل کلام ہے۔ اور پھر کوئی مطلع یا کوئی شعر پڑھ دیا کرتے تھے مثلاً ؎

غم سے ہوئے ہیں بال ہمارے سفید بجھ

سر میں پھپھوندی لگ گئی آنکھوں کی سیل سے

نقل

داروغہ اچھے صاحب ایک بزرگ لکھنؤ جناب انیس مرحوم کے شاگرد تھے اور دربارِ انیس کے حاضر باشوں میں داخل تھے۔ سال بھر کے بعد ایک مجلس بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے اور تمام

رؤسائے شہر اور شرفاء و کاملین سے دعدہ لیتے تھے اور مرثیہ خوانی کا بڑا دعوے تھا۔ مقررہ مجلس میں میر انیس کا نیا مرثیہ پڑھے۔ میر انیس مرحوم بھی موجود تھے۔ داروغہ صاحب نے اپنی دانست میں مرثیہ خوانی کے خوب خوب جوہر دکھائے اور بڑے فخر و مباہات سے مرثیہ تمام کیا۔ مجلس ختم ہوگئی۔ والدِ مرحوم فرماتے تھے کہ اُس روز جو میں حسبِ دستور میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو میر انیس نے مجھ سے فرمایا کہ آپ نے داروغہ صاحب کا پڑھنا دیکھا۔ میں نے بھی تعریف کی۔ میر انیس مرحوم کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا اور پھر فرمایا بھئی تم ایسا کہتے ہو۔ میرے مرثیہ کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دیں۔ میرے مضامین پر ظلم کیا۔ میرے قلب پر جو کچھ صدمہ گذرا ہے اُس کو میں ہی خوب جانتا ہوں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ داروغہ اچھے صاحب کی نفس آگئی۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ دیکھئے یہاں بھی مجھ سے داد لینے آئے ہیں۔ جیسے ہی داروغہ صاحب نفس سے اُترے میر انیس نے فرمایا کہ اچھے صاحب آج کی مجلس یادگار پڑھے ہو۔ میں حیران ہوں کہ میرے خیالاتِ شاعری کے لئے تم میں جذباتِ خوانندگی کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ داروغہ صاحب نے تسلیم کی اور بیٹھے۔ میر انیس نے پھر سلسلۂ تعریف شروع کیا۔ داروغہ صاحب کھڑے ہو گئے اور پھر ایک فراشی سلام کیا۔ اس ترکیب سے دس پانچ مرتبہ داروغہ صاحب کو اُٹھ بیٹھ کرنا پڑی۔ پھر میر انیس مرحوم نے جنابِ نفیس کو بُلوایا اور اُن سے مخاطب ہوکر تعریف شروع کی۔ کیوں بھئی خورشید علی تم نے اچھے صاحب کا پڑھنا سُنا۔ جنابِ نفیس نے بھی تعریف کی۔ اب داروغہ صاحب اپنے جامہ میں نہ سماتے تھے۔ میر صاحب نے میر نفیس سے فرمایا کہ خدا جانے آج تک اس مرثیہ کو میں کیا پڑھا اور تم کیا پڑھے۔ مرثیہ کے جوہر تو آج داروغہ صاحب کے پڑھنے سے کُھلے ہیں۔ داروغہ صاحب اس مبالغہ پر اور بھی پھول گئے اور حقیقتِ امر کو کچھ خاک نہ سمجھے۔

آخری مجلس

میر انیس مرحوم نے آخری مجلس جناب شیخ علی عباس صاحب وکیل کے مکان پر پڑھی ہے اور اُس کے بعد کوئی مجلس نہیں پڑھی۔ اخی المعظم جناب عارف، جناب سید محمد صاحب خریش جناب نفیس، میر محمد تقی صاحب شاگردِ رشید جناب نفیس، شیخ حسین بخش صاحب، یہ سب حضرات اس تحقیق پر متفق اللفظ شہادت دیتے ہیں اور جنابِ اشہری نے جو آخری مجلس کا پڑھنا شیش محل میں لکھا ہے۔ یہ اُن کی الہامی تحقیقات ہے۔

سفرِ حیدر آباد دکن

اب یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ فاضل شاعر نے زمانۂ شاہی تک لکھنؤ سے نقل و حرکت نہیں کی اور رؤسائے لکھنؤ نے جو کچھ قدر دانی کی میر صاحب نے اُسی پر اکتفا کیا۔ اوّل اوّل میر صاحب کے لئے مرثیہ خوانی ذریعۂ معاش نہ تھی اور اُن کے اجداد نے اس فن کو اس غرض سے اختیار نہیں کیا تھا کیوں کہ میر صاحب کے بزرگوں کا سلسلۂ ملازمت خاندانِ بہو بیگم صاحبہ سے تھا اور اُن کی مالی حالت بقدرِ ضرورت درست تھی مگر زمانہ اپنے تغیرات سے انسان کے ارادوں کو دوسرے راستوں کی جانب کھینچ لیتا ہے۔ اس وجہ سے انتزاعِ سلطنت کے بعد میر انیس کو بھی سفر کرنا پڑا۔ افضل الدولہ کے وقت میں حیدر آباد سے کئی مرتبہ میر انیس کی طلبی کا پیغام آیا مگر وہ زمانہ اور تھا میر صاحب نے انکار کر دیا۔ آخر ۱۸۵۹ء میں اوّل مرتبہ میر انیس نے پٹنہ کا سفر کیا اور پھر ۱۸۶۰ء میں دوسری مرتبہ نواب قاسم علی خان کی طلب سے عظیم آباد گئے اور ۱۸۷۱ء میں جب کہ ارسطو جاہ غفران پناہ کے خلف الرشید مولوی سید شریف حسین خان صاحب حیدر آباد میں تھے تو اُن کی تحریک سے نواب

تہور جنگ بہادر نے میر انیس کو طلب کیا اب بھی اُن کی پابندیِ وضع گھر سے نہ نکلنے دیتی تھی مگر چند معززین کی سفارش سے مجبور ہو کر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ میر انیس کی قدر دانی اہلِ دکن نے اندازہ سے زیادہ کی کہ خود میر انیس کو جس کا گمان نہ تھا۔ یہ بات جو میر انیس کے ذہن میں جم گئی تھی کہ ممالکِ غیر کے لوگ میرے کلام کی قدر نہیں کر سکتے، یہ خیال قابلِ اعتراض نہیں ہے اس لئے کہ میر انیس کو جن باتوں پر ناز تھا اور جس شاعری پر وہ فخر و مباہات کرتے تھے اُس کے لئے نصاب و لغات کی ضرورت نہ تھی اور نہ وہ باتیں علم و فضل پر مبنی ہیں بلکہ محض زبان دانی درکار ہے۔ لکھنؤ میں بھی اُن کے جوہرِ زبان کے پرکھنے کی قابلیت عموماً پیدا نہیں ہوئی بلکہ چند خاندان مخصوص ہیں جن کو اہلِ زبان کہنا چاہیئے اور وہی میر انیس کی زبان کی داد دے سکتے ہیں۔ جب ۱۹۰۵ء میں میں اپنے سلسلۂ ملازمت کے ذریعے سے حیدر آباد پہنچا ہوں تو اُس وقت میں اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ حیدر آباد پہنچنے پر میں اِس کام میں منہمک ہو گیا کہ اکابرِ دکن سے میر انیس کے سوانح کی تحقیقات کروں۔ جب میں اپنے والد کے ہمراہ ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد میں تھا اور دفترِ رکاب سعادت کی باریابی کا شرف حاصل تھا، اُس وقت سے تمام ارکان دولت کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ لہٰذا حقوقِ دیرینہ پر نظر کر کے نواب ناظم الدولہ محبوب یار جنگ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ نواب صاحب مرحوم نے کمالِ شفقت سے امداد کا وعدہ کیا اور حیدر آباد کے قیام میں اکثر دن اور راتیں ایسی گذریں جو اِس متبرک فرض میں صرف ہوئیں۔ نواب صاحب اپنی گاڑی بھیج کر دوپہر کو بلواتے تھے۔ اکثر دوپہر کا کھانا نواب صاحب کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اُس کے بعد یہ کام شروع ہو جاتا تھا۔ نواب صاحب خود بھی میر انیس سے حُسنِ عقیدت رکھتے تھے۔ اس وجہ سے اِس کام میں بڑی دلچسپی ظاہر کرتے تھے۔ افسوس اس کتاب کے ختم ہونے سے پیشتر نواب مرحوم کا دورِ حیات ختم ہو گیا اور میری اکثر امیدیں خاک میں مل گئیں غفر اللہ تعالیٰ شانہٗ۔

میر انیس مرحوم جب حیدر آباد تشریف لے گئے تو براہِ راست ریلوے لائن جاری نہیں تھی۔ بہت دور تک گھوڑا گاڑی کی ڈاک پر سفر کر کے براہِ گلبرگہ میر صاحب داخلِ بلدہ ہوئے ہیں۔ اِس سفر کی زحمت سے میر انیس مرحوم بیمار ہو گئے تھے اور تپ میں مبتلا تھے۔ لہٰذا اُس روز مجلس پڑھنے سے انکار کیا۔ اتفاق سے حیدر آباد میں یہ خبر اُڑ گئی کہ میر انیس کے علالتِ مزاج کا صرف بہانہ ہے۔ میر صاحب حیدر آباد آئے ہی نہیں۔ نواب تہور جنگ نے عرض کیا کہ حضور منبر پر تشریف لے جائیں اور صرف ایک رُباعی پڑھ کر اُتر آئیں تو کمال عزت افزائی ہوگی کیوں کہ دشمنوں نے میری رسوائی کے لئے آپ کے تشریف نہ لانے کی خبر تمام شہر میں اُڑا دی ہے۔ میر صاحب نے فرمایا مجھ میں بالکل قوت نہیں ہے اور نہ میرے ہوش و حواس درست ہیں۔ محبوب[۱] یار جنگ فرماتے تھے کہ میں نے یہ صلاح دی کہ کسی حکیم حاذق سے میر صاحب کا معالجہ رجوع کرو تاکہ غلبۂ تپ کم ہو اور کچھ بھی طاقت پیدا ہو جائے تو پھر لوگ خوشامد کر کے اپنا مطلب پورا کریں گے۔ یہ صلاح پسند ہوئی اور کئی حکیموں کے نام پر استخارہ دیکھا گیا۔ ڈاکٹر مرزا علی صاحب کے نام پر استخارہ واجب آیا۔ میر صاحب ڈاکٹر کا نام سُن کر متعجب ہوئے اور کہا میں نے کبھی ڈاکٹر کا علاج نہیں کیا مجھے احتیاط ہے۔ نواب صاحب نے کہا کیا مضائقہ ہے۔ میر صاحب نے فرمایا سُنتا ہوں کہ ڈاکٹر اپنے معمولات میں شراب کو ہر ایک مرکب کا جزوِ اعظم سمجھتے ہیں۔ میں اُن کی دوا کا استعمال نہیں کروں گا۔ محبوب یار جنگ نے کہا کہ حضور ڈاکٹر صاحب میرے خالو ہیں۔ مسلمان ہیں۔ آپ کسی قسم کا شک نہ کریں۔ ڈاکٹر کا لفظ اُن کے نام میں بحیثیت پیشہ ہے ورنہ اُن کے تمام عقائد مسلمانوں کے ہیں۔ نواب صاحب کے اس بیان سے میر صاحب کا شک جاتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے تپ کا زور توڑنے کو کوئی دوا

---

[۱] ڈاکٹر مرزا علی صاحب مرحوم، نواب محبوب یار جنگ مرحوم کے خالو تھے اور فنِ ڈاکٹری میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور ملازمِ بادشاہ بھی تھے۔

دی میر صاحب کو تھوڑی دیر تک پسینہ آتا رہا اور پھر بخار یک لخت اُتر گیا اگرچہ کسل تھا مگر معززین ارکانِ سلطنت کی خوشامد سے مجبور ہو کر مجلس میں تشریف لائے۔ ذیل کی دو رباعیاں فی البدیہہ تصنیف فرما کر پڑھیں اور منبر سے اُتر آئے ؎

رُباعی

سرسبز یہ شہرِ فیض بنیاد رہے
اللہ و رسولؐ حق کی امداد رہے
یارب آباد حیدرآباد رہے
نواب ایسا رئیسِ اعظم ایسے

رُباعی

علم و عمل و عطا کا دستور ہے یہاں
موجود ہے جو کچھ جسے منظور ہے یہاں
رحمت رحمت پہ نُور پر نُور ہے یہاں
مختارالملک و بندگانِ عالی

ایک مرتبہ میر انیسؔ نے حیدرآباد کی مجلس میں مرثیہ کے اختصار کا قصد کیا۔ سامعین نے تقاضا کیا حضور خدا کے لیے ہم سب جانیں لڑائے ہوئے ہیں۔ میر انیس مرحوم کو غصہ آگیا اور فرمایا کیا خوب آپ کی جانیں لڑی ہیں تو میں کیا کروں ہمیری تو جان پر بنی ہوئی ہے۔ حیدرآباد کی ایک مجلس میں میر صاحب صرف بارہ بند پڑھ کر اُتر آئے تھے آج تک وہ سین لوگوں کی نظروں میں پھر رہا ہے اور ذکر کرتے ہیں کہ اُن بارہ بندوں کے پڑھنے کی شان کبھی نہ بھولے گی۔ اس سے زیادہ کوئی ملک اور کیا قدر دانی کرے گا کہ میر صاحب نے صریحی اہلِ دکن کو نافہم و ناداں سمجھا مگر انہوں نے کچھ اِس بات کا خیال نہ کیا اور میر صاحب کے کلام کی داد ایسی دی کہ آج تک کسی شاعر کے لئے نصیب نہ ہوئی۔ واقعہ اس طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

میر صاحب مرثیہ کے بارہ بندوں تک پہنچے تھے کہ دفعتاً خیال گذرا کہ سامعین کو پوری توجہ نہیں ہے۔ بس بددل ہو کر حاضرین پر ایک غائر نظر ڈالی۔ مرثیہ توڑ کر زانو پر رکھ لیا اور ایک حسرت ناک آواز سے فرمایا ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں، پھر ناسازیِ طبیعت کا بہانہ کر کے منبر سے اُتر آئے۔ اگرچہ اُس کے بعد خوب خوب پڑھے اور اہلِ دکن نے خوب خوب داد دی

اور آخر میں خود میر انیس مرحوم کو حضراتِ دکن کی سخن فہمی کا اعتراف ہوا لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک نئے شہر میں پہنچ کر انسان انواع و اقسام کے وہم و شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

پھر میر انیس سا نازک مزاج۔ میر صاحب کو یہ خیال کہ مصرع زبان سے نکلے اور سامعین متاثر ہو جائیں۔ اور وہاں ہر شخص حیرت و استعجاب میں مبتلا کہ اللہ اکبر کہاں میر انیس اور کہاں حیدرآباد۔ یہاں اظہارِ جوہرِ زبان مدِّ نظر وہ لوگ رسمِ مدح و ثنا سے بے خبر۔ ذاکر کا رعب۔ معززین کا مجمع۔ دابِ انجمن، تہذیب و اخلاق کی پابندی۔ ان اسباب نے ناظرین کو مرعوب اور میر انیس کو بیدل کر دیا۔ مگر آخر میں فاضل شاعر کے کمال نے اپنی معجز بیانیوں سے سرزمینِ دکن کو لکھنؤ بنا کر چھوڑا اور فصاحتِ کلام کا سکہ بٹھا دیا جو آج تک جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔

ایک مرتبہ حیدر آباد کے ایک رئیسِ اعظم مجلس میں تشریف لائے چونکہ صاحبانِ دکن اُن کے اعزازِ خاندانی اور شانِ دولت مندی سے واقف تھے۔ اس لئے ہاتھوں ہاتھ منبر کے قریب پہنچا دیا۔ ہمعصروں نے سرو قد تعظیم کی اور میر صاحب نے فقط اتنا ہی کہا کہ بسم اللہ۔ یہ امر رئیس مذکور کے خلافِ مزاج ہوا اور اپنے مصاحبین سے خفیہ طور پر سازش کی کہ میر صاحب کچھ پیغمبر نہیں ہیں جو خواہ مخواہ ان کی عظمت کا خیال کیا جائے۔ یہ میری تعظیم کو کھڑے نہیں ہوئے۔ تم لوگ ان کی تعریف نہ کرنا۔ وہ بے چارے مجبور تھے روزگار کا معاملہ اگر پابندیِ حکمِ آقا نہ کرتے تو کیا کرتے۔ میر صاحب اس سرگوشی کو تاڑ گئے مگر اُس شیرِ بیشۂ فصاحت کو کسی کی تعریف کی کب پروا تھی وہاں کلام کی تاثیر پتھر کے دل میں ساری ہوتی تھی۔ انسان کا قلب کس شمار میں ہے۔ اب وہ وقت آگیا کہ میر صاحب منبر پر تشریف لے گئے اور چند رُباعیوں کے بعد ایک سلام شروع کیا۔

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے
اُڑ گیا جب رنگ رُخ سے استخواں پیدا ہوئے

اس پہلے شعر پر نواب کو کسی قدرتی دباؤ سے جنبش پیدا ہوگئی۔ دوسرا شعر پڑھنے سے پہلے

میر انیسؔ مرحوم نے نواب صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا سُنیئے یہ آپ کے سُننے کا شعر ہے ؎

تربتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

فاضل شاعر کی نگاہیں بجلی بن کر نواب کے سینے میں در آئیں اور وہ بداخلاقی کا خیال جو تعصب کے فولادی تاروں سے جکڑا گیا تھا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مُنھ پھیلا کر چِلّا اُٹھے ماشاء اللہ، سُبحان اللہ۔ یہ بات حضور ہی کے لئے ہے۔ جب خود بدولت نے آواز لگائی تو پھر وابستگانِ دامنِ دولت بھی برس پڑے کیوں کہ بہت دیر سے بھرے بیٹھے تھے۔ یہاں تیسرا شعر شروع ہوا اور نواب صاحب پر مسمریزم کا عمل پورا ہو گیا ؎

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اِس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

بس اب پورا رنگ جم چکا تھا اور مجلس بے چین ہو رہی تھی۔ اس سلام کو اس واقعہ سے کس قدر حیرت ناک مناسبت ہے مطلع تو خیر ایک اعلیٰ درجے کی بلاغتِ شاعری کا نمونہ ہے مگر دوسرا تیسرا شعر نواب صاحب کی تنبیہہ کا تازیانہ ہے۔ شاعر کا خیال یہ ظاہر کر رہا ہے کہ دولت مندوں کو اہلِ کمال کے سامنے رفعت و سرفرازی حاصل نہیں جیسا کہ اس وقت شاعر اپنے کمال کے ذریعے سے اہلِ مجلس کی نشست سے بلند ترین منزل پر بیٹھا ہے اور سرمایۂ دولت پر غرور کرنے والوں کو اُس کی عظمتِ کمال مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی شانِ ریاست کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کر کے جوہرِ کمال کے قدردان بن جائیں۔ بس یہاں تک تو اس سلام میں تلمیحِ شاعرانہ پائی جاتی ہے۔ اب چوتھا شعر اپنے غم ناک مضمون اور درد بھری لفظوں سے معینِ گریۂ اہلِ عزا ہے ؎

بود و نابودِ علی اصغرؑ کا کیا کیجے بیاں — بے زباں دُنیا سے اُٹھتے بے زباں پیدا ہوئے

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شاندار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

نقل

ایک مرتبہ بعدِ ختمِ مجلس صاحبِ خانہ نواب تہوّر جنگ بہادر میر صاحب کو فنس میں سوار کرنے کے لئے دروازے تک تشریف لائے جب میر صاحب فنس میں بیٹھ گئے تو نوابِ ممدوح نے میر انیس کی نعلین اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر فنس میں رکھ دیں اس حرکت پر اکثر اکابرِ شہر اور ارکانِ سلطنت نے اعتراض کیا خصوصاً خاندانِ مختار الملک مرحوم کے کئی ممبروں کو سخت ناگوار ہوا نواب تہوّر جنگ بہادر نے اس اعتراض کا کیا خوب جواب دیا ہے۔

سر سالار جنگ مرحوم جس زمانہ میں لندن تشریف لے گئے تھے اُس وقت ملکۂ آنجہانی سے ایک پرائیویٹ ملاقات کی نقل یوں بیان کی جاتی ہے:

ملکۂ آنجہانی ایک بڑے ہال میں چہل قدمی کر رہی تھیں اور موجودہ پرنس آف ویلز گود میں لئے تھیں۔ مختار الملک مرحوم سے باتیں کرتی جاتی تھیں کہ اتفاق سے پرنس آف ویلز کا جُوتہ فرش پر گر پڑا۔ مختار الملک مرحوم نے فوراً اٹھالیا اور اُس کمسن بچے کے پاؤں میں اپنے ہاتھ سے پہنا دیا۔ یہ واقعہ معترض کو یاد دلا کر نواب صاحب نے فرمایا کہ میں نے میر انیس کا جُوتہ حُسنِ عقیدت سے اٹھایا ہے اور پرنس آف ویلز کا جُوتہ خوشامد سے اٹھایا گیا تھا۔ اب اِس فرق کو اربابِ بصیرت دیکھ سکتے ہیں۔

میں سلسلۂ واقعات میں اُوپر بھی بیان کر چکا ہوں کہ میر انیس مرحوم کی لائف فسانہ خیز واقعات سے خالی ہے۔ مجھ کو واقعات بہم پہنچانے میں جو کچھ کاہش ہوئی وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اگر ایسی مجبوریاں نہ ہوتیں تو اس وقت تک

ہندوستان کے اہلِ قلم خاموش نہ بیٹھتے۔ میر انیس کے متعلق اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا

ہے وہ نہایت مختصر ہے اور اُن خیالات کو بایوگرافی سے کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ جناب اشہری نے میر انیس کے واقعات کو سوانح عمری کے طور پر لکھا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ کتاب اعتبار کے قابل نہیں اور واقعات اکثر غلط ہیں۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے ہمعصر اہلِ قلم میری اس کوشش کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے۔ بہرکیف واقعات وسانحات کا سلسلہ ختم کر کے اب میں ایک دوسرے فرض کی جانب رجوع ہوتا ہوں۔ میں نے اس کتاب کو دو حصّوں پر منقسم کیا ہے۔ اوّل حصّہ میں سوانح عمری اور دوسرے حصّہ میں میر انیس مرحوم کے کلام پر ریویو۔ پہلا حصّہ اپنے ہیرو کی مقدّس زندگی کے انجام پر انجام پاتا ہے۔

۲۴ رمضان ۱۲۹۱ھ کا منحوس دن تھا جس روز میر انیس دردِ سر اور تپ میں مبتلا ہوئے۔ اِس سے پیشتر اُن کو سوائے ضعفِ پیری کے اور کسی مرضِ مزمن کی شکایت نہ تھی۔ تپ رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور چند روز کے بعد ورمِ جگر کی شکایت لاحق ہوئی۔ اس درمیان میں لکھنؤ کے مشہور اطبّا کا علاج جاری رہا ہے۔ حکیم مرزا محمد جعفر مرحوم، حکیم شیخ علی محمد مرحوم، حکیم میر باقر حسین مرحوم ساکن محبوب گنج شاگردِ رشید مرزا محمد علی مرحوم۔ ان اطبّائے حاذق نے اپنی کوششوں سے کوئی کسر باقی نہ رکھی کیوں کہ میر انیس مرحوم ہردلعزیز تھے اور اُن کی زندگی عموماً ممالکِ غیر اور خصوصاً اہلِ لکھنؤ کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ مگر موت جس کا نام ہے یہ وہ مسئلہ ہے جس کی تحلیل فلاسفۂ یونان اور دانایانِ فرنگ سے بھی نہ ہوسکی۔ علمِ سائنس کے حیرت انگیز کرشمے دکھانے والے بھی اس طلسمی راز کو دریافت نہ کر سکے۔ افسانۂ زندگی کے ابتدائی باب پر بطریقِ عنوان جلی قلم سے جو لفظ لکھا گیا ہے وہ موت ہے آہ موت! صرف تین حرف کا لفظ جو انسانی زندگی پر اپنا خوفناک اثر ڈالتا ہے۔ ایسا معنی خیز لفظ تلاش کرنے سے دوسرا کسی لغت میں نہیں مل سکتا۔ اس افسانہ کی ابتدا سے انتہا تک جس قدر ضخامت ہے اُس کا ایک ایک ورق اس ہولناک لفظ کی دہشت سے بھرا ہوا ہے اور برسوں کی خوشگوار زندگی کے واقعات اِس ٹریجک سین پر ختم ہوجاتے ہیں اور یہ ڈراپ

سین پھر اُٹھایا نہیں جاتا۔ خالقِ برحق کے سایۂ رحمت میں جانا اور حور و بہشت کی آرزو
میں جان گنوانا ابنِ آدم کے لئے ایک مبارک روز ہے۔ مگر بڑے بڑے مستقل مزاج پاکیزہ
نفس، نیک اعمال انسان اُس تاریکی میں جاتے ہوئے گھبرا جاتے ہیں جہاں اُن کو اپنی
زندگی کی دلفریب تصویر سایہ کی طرح دوڑتی نظر آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے فنا ہو
جاتی ہے۔ نفس کے وہ مضبوط تار جو حوادثِ عالم سے گھتیاں ہو کر بھی نہیں ٹوٹتے، عالمِ نزع
کی آخری ہچکی کے ایک جھٹکے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ مداخل و مخارجِ زندگی
سے جنسِ کمال کی یادگار چھوڑنے والے ہی قابلِ قدر ہیں جو اوروں کو کتابِ زندگی کا سبق
دے جاتے ہیں۔ جن واقعات کی تعمیل ملائکۂ مقدس کے ہاتھ میں ہے وہ اپنے مالکِ حقیقی
کے حکم کی تعمیل کرنے میں مجبور ہیں۔ خدا کے بنائے ہوئے علموں کے عالم اُس میں کچھ دست
اندازی نہیں کر سکتے۔ شیخ الرئیس ہو یا شفائی خان دونوں کو خاموشی سے دیکھنا پڑتا ہے
کہ اُن کا مریض بسترِ مرگ پر دم توڑ رہا ہے اور اُن کے آبِ حیات میں منقی نسخے کچھ کام نہیں
دیتے۔ یہ وہ ناکامیاں ہیں جن کی خبر کتابِ مقدسِ آسمانی میں موجود ہے۔ اذا جاء اجلھم
لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ قانونِ قدرت کے وہ کلیہ جن کو مقدس برگزیدگانِ درگاہِ
صمدی کی دعائیں بھی نہیں توڑ سکتیں تو پھر لقمان کے نباتات کس شمار میں ہیں ؎

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید
زجامِ دہر مے، کُلُّ مَن علیھا فان

میر انیسؔ کا مرض بڑھتا گیا اور آخر میں اسہالِ کبدی اور تپِ دق کے مرض میں ۲۹ شوال
روزِ دوشنبہ قریب مغرب اپنے مکان واقع چودھری محلہ میں انتقال فرمایا۔ اِنّا للہ و
اِنّا الیہ راجعون۔

قبلہ و کعبہ جناب غفراں مآب کے امام باڑہ میں قبلہ و کعبہ سید بندہ حسین اعلیٰ مقامہٗ
نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے باغ واقع سبزی منڈی میں دفن ہوئے جس کا ذکر میں اُوپر

کر چکا ہوں۔ میر انیس مرحوم کی موت سے جو ہنگامہ عالم میں پیدا ہو گیا اُس کے لکھنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ایسے اہلِ کمال کا دُنیا سے گذر جانا کچھ معمولی حادثہ نہ تھا۔ اخباروں نے مہینوں رسمِ تعزیت میں کالم کے کالم سیاہ کئے۔ دُنیا کے شعرا نے تاریخیں کہیں۔ اُن تاریخوں کا مجموعہ اگر اس کتاب میں جمع کیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے گا۔ اس لئے صرف دو تین مادّے میر انیس کی تاریخِ انتقال کے لکھے دیتا ہوں جس سے ناظرین کو تاریخِ وفات کا پتہ چل جائے اور بس۔

مولوی علی میاں کامل مرحوم

انیسِ عالمِ وحدت ولائے آلِ عباست

سید حسین مرزا عشق مرحوم

بادا انیس عشق حسین اندریں مزار

یہ بھی ظاہر کر دینا میرا فرض ہے کہ سب سے زیادہ جس تاریخ کی شہرت ہوئی وہ جنابِ مرزا دبیر مرحوم کی تصنیف ہے اور اُس کا مصرعۂ مادّہ یہ ہے ع طُورِ سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس، پوری تاریخ کلیاتِ مطبوعۂ مرزا صاحب میں موجود ہے۔

اِس مادّہ میں مرزا صاحب مرحوم نے صنعت زبر و بینہ کا دعوےٰ کیا ہے لیکن گروہِ شعرا کو اس میں کلام ہے کیوں کہ زبر و بینہ کے قاعدے سے سنِ مقصود کا استخراج نہیں ہوتا، مرزا صاحب کے فاضل صاحبزادے نے اپنی تصنیف مقیاس الاشعار میں تاویلاً تصحیح کی ہے مگر واقفانِ فن کی تسلّی نہیں ہوئی۔

جب فاضل شاعر بسترِ مرگ پر خدا کے اُس آخری حکم کا انتظار کر رہا تھا جس کی تعمیل ملک الموت کے سپرد کی گئی ہے تو اُس کو دنیا اور سامانِ دنیا سے کچھ دلچسپی نہ تھی اور وہ دُنیا کو اُسی نظر سے دیکھ رہا تھا جیسا کہ اپنی تصنیفوں میں بے ثباتیِ عالم اور مسئلۂ موت پر استدلال کیا ہے۔ عالمِ نزع کے وہ آخری شاعرانہ خیالات جو چند منٹ میں فنا ہو جانے والی قوتوں

درحقیقت میر انیس مرحوم کے کلام پر نقادی ایک اہم کام ہے۔ میں اُوپر بھی لکھ آیا ہوں کہ ہجوم مضامین و افراطِ جذبات و شاعرانہ کے ساتھ ساتھ سلاستِ زبان اور لفظوں کی دلفریبی نقّاد کی طبیعت میں انتشار پیدا کر دیتی ہے۔ ایک ایک لفظ کی نسبت دل پر جو اثر پڑتا ہے اس کو مُشرح اور مفصل بیان کرنے میں ذہن قاصر ہے۔ زبان کی لطافت اور خیالات کی باریکیوں کو صاحبِ مذاقِ سلیم ہی خوب سمجھ سکتا ہے اس لئے میر انیسؔ کے مجموعۂ تصنیفات سے صرف چند نظموں کی تنقید پر اکتفا کروں گا اور نیچرل مذاق کے نمونے پیش کر دوں گا۔ واقعاتِ عالم، مظاہرِ قدرت و مناظرِ حقیقت، خصائل و خصائصِ انسانی کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرنے کے لئے میر انیسؔ کا معجز نگار قلم فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتا ہے۔ مغرب کے اہلِ قلم اور یورپ کے ناولسٹ جن کی تصنیفات اس وقت نیچرل فلاسفی کا ذخیرہ مانی جاتی ہے اور ہندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اس تخیل کو وظیفہ میں داخل کر لیا ہے وہ حیرت انگیز نظروں سے دیکھیں گے کہ ہندوستان کا مقدس شاعر کیسی کیسی موشگافیاں کرتا ہے مختلف مضامین کے گوہرِ نایاب ایک لڑی میں پرو کر یہ خوشنما ہار پبلک کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں۔

صبح کا نظارہ

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور　　دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے کوہِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ معبود کا ظہور　　وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور

گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

مصرعِ اول میں تین جگہ "وہ" کا لفظ لائے ہیں جس سے درجہ بدرجہ مصرع کی قوت اور شوکت کو ترقی دی ہے۔ ستاروں کی چھاؤں سے نورانی کیفیت کا اظہار ہے یعنی عالمِ صبح کی نورانی کیفیت قدرت کا نور ہے اور انوارِ الٰہی کوہِ طور پر باعثِ غشی جناب موسیٰ۔ تیسرا مصرع ظاہر کرتا ہے کہ صبح کا وقت چوں کہ عبادت کے لیے خاص ہے اس لئے گلوں سے بھی قدرتِ معبود کا ظہور ہے۔ چوتھے مصرع سے عملِ عبادت کی تکمیل فرماتے ہیں۔ بیت میں نازک خیالی دکھائی ہے یعنی باوجود ان رنگینیوں اور دلفریبیوں کے جنگل کی تعریف ہے باغ نہیں ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ جنگل کی کیفیت دیکھ کر گلشن خجل تھے اور باغوں سے زیادہ یہاں کی فضا فرحت خیز تھی ؎

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا　　دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا　　خنکی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا

پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

اس بند کو بھی اسی انتظام سے شروع کرتے ہیں یعنی مصرعِ اول میں تین جگہ "وہ" کا لفظ موجود ہے اور یہ فصاحتِ شاعری کے لوازم ہیں۔ سہانا سا میں "سا" محاورہ کی جان ہے اور

اہلِ زبان کی پہچان ہے۔ جوشِ گُل، نالۂ مرغانِ خوش نوا، صبح کی ہوا۔ سبز سبز کی تکرار، ان دلفریب لفظوں کا محلِ استعمال شاعر کی رنگینیٔ خیال کا پتہ دیتا ہے اور یہی وہ نظارے ہیں جن پر سینری لکھنے والوں سے قلم نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ چھٹا مصرع تشبیہ تام ہے اور استعارہ کی جان ہے۔ تیسرا بند بھی اُسی التزام سے شروع ہوتا ہے ؎

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار — پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا باربار — بالائے سر ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زہرِ گلشنِ زہراؑ جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

تمام بند صنعتِ مراعات النظیر سے بھرا ہوا ہے اور پھر شوکتِ الفاظ کا یہ حال ہے کہ کسی جلیل القدر بادشاہ کی سواری کے آگے کڑکا ہوتا چلا جاتا ہے۔ کوئی استعارہ مضامینِ ذاتی سے خالی نہیں، شبنم کے قطرے گہر ہائے آبدار نہیں تو اور کیا ہیں۔ سبزہ زار، شاخ بار بار بلبل ہزار زہر زہرا یہ الفاظ کس بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں کہ بادی النظر میں صنعتِ مراعات النظیر کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ سب فیضانِ قدرت ہے۔ بہت دُور تک عالمِ صبح کی کیفیت اور گلِ صحرائی کی دلفریبیاں بیان کرتے ہوئے گلہائے ریاضِ نبوتؐ کی مدح سرائی سے پیوندِ نظم پیدا کیا ہے (اللہ ری خزاں کے دن اُس باغ کی بہار) اس سے بہتر براعتِ استہلال عرفی و قاآنی کے قصائد میں بھی غیر ممکن ہے۔ بعد اُس کے نمازیوں نے نمازِ صبح کے لئے مصلّے بچھا دیئے۔ جنابِ علی اکبرؑ نے اذان دی۔ جنابِ زینبؑ اپنے نورِ چشم بھتیجے کے لحنِ اذان اور حُسنِ قرأت کے متعلق فرماتی ہیں ؎

یہ حُسنِ صوت اور یہ قرأت یہ شدّ و مد — حقا کہ افصح الفصحا ہے اِنہیں کا جد
گویا ہے لحنِ حضرتِ داؤدِ با خرد — یارب رکھ اِس صدا کو زمانہ میں تا ابد

شُعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

مصرعِ اوّل میں فصاحت کے ساتھ بلیغ الفاظ کے طریق نظم کی تعریف محال ہے یہ چوتھا مصرع دُعائیہ ہے جو ایک معصومۂ مقدسہ اپنے پیارے بھتیجے کے حق میں استعمال فرماتی ہیں۔ محبت کے آبِ حیات اور انجام کار کے مآل میں ڈوبا ہوا ہے گویا دُعا کے ساتھ مایوسی اور مرگ جوانی کی ملحکامی ظاہر ہو رہی ہے۔ بیت میں خوش آوازی کے متعلق عجب نازک تشبیہہ کا تصرف ہوا ہے تمام خاندانِ رسالت کا مجمع اُس سے ریاضِ رسولؐ کا استعارہ۔ یہ سب شاعرِ فطری کی معجز نگاریاں ہیں۔ ایک مقام پر نمازیوں کی تعریف فرماتے ہیں ؎

قرآں کھُلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز　　بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھے شہِ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقبِ شاہِ سرفراز　　کرتی تھی خود نماز بھی جن کی ادا پہ ناز
صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحفِ ناطق کے نور کی

جماعتِ نماز کو کھُلے ہوئے قرآن سے تشبیہہ دینا باعتبارِ وجہِ شبہ اور باعتبارِ عظمت کس قدر مناسب ہے اور اس تشبیہہ کے بعد کس چیز میں فوقیت و اوّلیت باقی تھی جس سے امامِ جماعت کو تشبیہہ دی جاتی۔ اس لئے فرماتے ہیں ع بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھے شہِ حجاز۔ انہیں دو مصرعوں پر استعارہ کے مناسبات و لوازم کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ بیاض و بین سطور سطریں آیتیں مصحفِ ناطق نور کسی چیز کو چھوڑا نہیں ہے۔ مضامینِ بلند کی ترتیب نظم کے لئے الفاظ مناسب و فصیح کا الہام ہوتا تھا ؎

ہتھیار اُدھر لگا چکے آقائے خاص و عام　　تیار اُدھر ہوا علمِ سیّدِ انام
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام　　روتی تھیں تھامے چوبِ علم خواہرِ امام
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینبؑ کے لال زیرِ علم آ کھڑے ہوئے

اس بند میں ایک نقارے کی تمہید اور بیت میں جنابِ عونؑ و محمدؑ کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے

اور چھٹے مصرع میں زیرِ علم آکھڑے ہوئے کا اشارہ یہ ہے کہ صاحبزادے اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ علمداری کا عہدۂ موروثی آج ہمیں ملے گا اس لئے تیار ہیں ؎

گردانے دامنوں کو قبا کے وہ گلعذار

مرفق تک آستینوں کو اُلٹے با فتخار

آبِ کوثر سے دھوئی ہوئی زبان اور عالمِ بالا پر پہنچا ہوا خیال شاعر کو ملے تو اس طرح سین لکھا جاتا ہے۔ بیان واقعی فصاحت میں ڈوبا ہوا ہے۔ فصاحت کا لفظ میری تحریر میں تنقید کے متعلق ہزاروں جگہ استعمال ہوگا مگر پھر بھی اُس سے کم جس قدر عملی طور پر میر انیس نے اپنی تصنیفات میں استعمال کیا ہے۔

دوسرا بند بھی انہیں موشگافیوں سے بھرا ہوا ہے اور صاحبِ کمال مصور یا جادو نگار شاعر اس تصویر کے ارادوں کو اپنے زور دار قلم کے ذریعہ سے نہیں دکھا سکتا۔

گہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانبِ علم

ایک مصرع میں ایک نظارا ختم ہوا اور دوسرے مصرع میں جذباتِ دلی کا اظہار۔

نعرے کبھی یہ تھے کہ نثارِ شہِ اُمم

تیسرا اور چوتھا مصرع اضطراری حالت ظاہر کرتا ہے یعنی دیکھئے منصبِ علمداری کسے ملتا ہے آخر میں بے چین ہو کر مادرِ گرامی سے پوچھتے ہیں۔

کیا قصد ہے علیِؑ ولی کے نشان کا

اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا

چھٹے مصرع میں ایک اور باریک پہلو ہے یعنی دعویٰ کیا ہے کہ علم نانا جان کا اس سے مراد و مقصود یہ ہے کہ ہمارے نانا کا علم ہے تو بہر طور ہمیں مستحق ہیں۔ اس تخئیل سے مصنف نے استقرارِ حق ظاہر کیا ہے کیوں کہ جنابِ زینبؑ یہ تو جانتی ہیں کہ صاحبزادے طالبِ ارث ہیں اور ان کا خیال بے جا نہیں مگر مظلوم بھائی کی مصلحت کا لحاظ رکھ کر بچوں کے ارادوں سے

ناراض ہوکر تنبیہہ فرماتی ہیں۔

زینبؑ نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امامؑ

چونکہ بچے ہیں، یہ بھی خیال ہے کہ کوئی طفلانہ حرکت نہ کر گذریں اس لیے دفعِ دخل فرماتی ہیں

دیکھو نہ کرنا بے ادبانہ کوئی کلام

یعنی امام حسینؑ سے طلبِ علم کی بابت درخواست نہ کر بیٹھنا۔

بگڑوں گی ہیں جو لوگے زباں سے علم کا نام

سعادت مند فرزندوں کو اپنی ناراضی سے دھمکاتی ہیں۔

لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبرؑ کو چھوڑ کے

شاعر نے سلسلۂ تقریر میں برہمیِ مزاجِ جنابِ زینبؑ کو رفتہ رفتہ قوّت دی ہے۔

سرکو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس بس قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے پھر جو بُرا یا بھلا کہوں
اِس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

تمثیلِ شاعرانہ کی تعریف کی جائے یا عناصرِ فصاحت کا بیان ہو کس کس چیز کی طرف نقاد کی طبیعت رجوع ہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ چاروں مصرعوں میں بزرگانہ تنبیہہ پائی جاتی ہے۔ مگر بیت میں تو غضب ہی کیا ہے (رونے لگوگے پھر) اس فقرہ نے بچپن کی شان دکھادی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے آخر کم سن ہیں، سعید ہیں، رشید ہیں، خاندانِ رسالت کے بچے ہیں، مادرِ گرامی غصّہ کریں تو جواب نہیں دے سکتے، کمالِ غیرت و ادب کا مقتضا یہ ہے کہ رو دیں، رو دینا بھی ماں کو گوارا نہیں اس لئے فرماتی ہیں کہ رونے لگوگے پھر اور چھٹے

مصرع سے تسکین دیتی ہیں کہ نہیں رونا نہیں۔ تم بچے ہو نا سمجھ ہو تمہاری ہر ایک ضد مقتضائے عمر ہے۔ عمداً نہیں۔ میں جانتی ہوں تمہیں یہ منظور نہیں کہ خلافِ مرضیِ امامؑ کوئی خواہش کرو لہٰذا اپنے ارادوں کو واپس لے لو اور اس کے ساتھ ہی منچلے بچوں کا خیال خاندانی شجاعت کی جانب منتقل کر دیا جاتا ہے۔

زخمی ہیں تین دن سے ہے مشکل کشا کا لال | اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال | میں لُٹ رہی ہوں اور تمہیں منصب کا ہے خیال

غم خوار تم مرے ہو نہ عاشق امامؑ کے
معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے

اِس طرزِ نظم میں کچھ شاعری کی رنگینیاں نہیں ہیں بلکہ فصاحتِ زبان کے ساتھ واقعات اصلی اور جذباتِ حقیقی کی تصویر کھینچی ہے۔ برہمیِ مزاج کے تیوروں سے والدۂ معظمہ نے فرزندانِ رشید کے ارادے پھیر دیئے اور جو طفلانہ خیال بچوں کی طبیعتوں کو ابھار رہا تھا اِس نصیحت و پند نے اُسے ضائع کر کے اطاعت و فرماں برداری کی طرف مائل کر دیا اور جوشِ محبت سے جاں نثاری کے ولولے پیدا ہو گئے۔

ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام | غصّہ کو آپ تھام لیں اے خواہرِ امامؑ
واللہ کیا مجال جو آب لیں علم کا نام | کھل جائے گا مریں گے جو یہ باوفا غلام

فوجیں بھگا کے گنجِ شہیداں میں سوئیں گے
تب قدر ہو گی آپ کو جب ہم نہ ہوئیں گے

گو جنابِ زینبؑ کا مقصود تو یہی تھا کہ فرزندوں کو خیالِ مرگ پر آمادہ کریں اور اُوپر کے چند بندوں میں غزواتِ جنابِ امیرؑ کا ذکر کر کے جوشِ شجاعتِ خاندانی کو متحرک کر دیا تھا مگر پھر بھی ماں کا دل ہے جب دیکھا کہ کمسن بچے جاں نثاری پر آمادہ ہیں تو دل بے چین ہو گیا۔

بس کہہ کے یہ ہٹے جو سعادت نشاں پسر | چھاتی بھر آئی ماں کی کہا تھام کر جگر

دیتے ہو اپنے مرنے کی پیار و مجھے خبر — ٹھہرو ذرا بلائیں تو لے لوں میں نوحہ گر

کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بُری لگی

بچّو یہ کیا کہا کہ جگر پر چھُری لگی

یہ زبان اور یہ خاندانِ امامت کے حرمِ مقدس کی گفتگو اور یہ خیالات کا اُتار چڑھاؤ میر انیس کا حصّہ ہے۔ اب جناب [illegible] مخاطب ہو کر بھانجوں کی نسبت اپنا خیال ظاہر فرماتے ہیں۔

نو دس برس کے سن ہیں یہ جرأت یہ ولولے — بچّے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی منچلے

اقبال کیوں کر ان کے نہ قدموں پہ منہ ملے — کس گود میں بڑے ہوئے کس دودھ سے پلے

بے شک یہ ورثہ دار جنابِ امیر ہیں

پر کیا کروں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

بچّوں کی شجاعتِ موروثی کی تعریف کرنے کے بعد کم عمری کی جانب اشارہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اُن کی عمریں قابلِ علمداری نہیں (اب جس کو تم کہو اُسے دیں فوج کا علم) کیا لازواری ہے اور فاضل شاعر نے سلسلۂ کلام میں کیا پُراسرار پیچیدگیاں پیدا کی ہیں اور سلسلۂ تقریر حلومِ تربت کے پایہ سے گرنے نہیں پاتا ہر ایک ختم ہو جانے والے خیال کو آنے والے واقعہ سے کیا دلچسپ تعلق ہے۔ یہ عذر تو ہو چکا ہے کہ بچّے کمسن ہیں اس لئے قابلِ علمداری نہیں پھر بھی عاشقِ زار بہن کی خوشنودیِ خاطر کے لئے دریافت فرماتے ہیں کہ اب جس کو تم کہو اُسے دیں فوج کا علم۔ اس مصرع میں دو پہلو ہیں اور دونوں کو اندازِ خوانندگی سے تعلق ہے اگر پڑھنے میں (تم) کے لفظ پر زور دیا جائے تو بچّے مستثنٰی ہو جاتے ہیں اور اگر (جس) کے لفظ پر قوت ڈالی جائے تو بچّے بھی داخلِ مستحقین ہیں۔ پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ بچّے تو کم سن ہیں ان کے علاوہ تم علمداری کے لئے کس کو پسند کرتی ہو۔ اور دوسرا مقصود یہ ہے کہ بچّے کمسن ہیں مگر باوجود صغر سنی میں تمہاری مرضی کا پابند ہوں اگر تم چاہو تو ان کو علم مل سکتا ہے فقط شاعر

کا خیال یہ ہے کہ بھائی کو بہن کی دل شکنی کسی طرح گوارا نہیں مگر جناب زینب چونکہ پابندِ مصلحتِ امامؑ ہیں اس لیئے۔

کی عرض جو صلاحِ شہِ آسمان حشم

فرمایا جب سے اُٹھ گئیں زہرائے باکرم — اُس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم

بیت میں میر انیسؔ نے اُس اجمال کی تفصیل کر دی ہے جس کی بابت میں نے اِس بند کے مصرعِ اوّل میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خُرد ہو

جس کو کہو اُسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

یہاں خُردوں کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا ہے۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ امامؑ کو اپنی تقریر سے بہن اور بھانجوں کی خاطر شکنی گوارا نہیں۔ مگر جنابِ زینب آخر کس بھائی کی بہن ہیں ان کو خلافِ مرضیٔ امامؑ کوئی راستہ اختیار کرنا منظور نہیں اس لیئے عرض کرتی ہیں۔

بولیں بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام — ہے کس طرف توجہ سلطانِ خاص و عام

قرآں کے بعد ہے تو شہِ دیں کا ہے کلام — گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام

شوکت میں قد میں شان میں ہمسر کوئی نہیں

عباسؑ نامدار سے بہتر کوئی نہیں

یہاں بہن نے اپنے پیارے بھائی کے دلی ارادے کا ترجمہ کر دیا اور شاعر کے قلم نے وہی فیصلہ کیا جس میں بہن کی اطاعت اور بھائی کی مصلحت کا راز پنہاں تھا۔ اب جنابِ زینبؑ اپنے چھوٹے بھائی کو شایانِ علمداری ظاہر کرنے کے بعد جناب امام حسینؑ سے چند خصوصیات کے متعلق تعریف کرتی ہیں۔

عاشق، غلام، خادمِ دیرینہ، جاں نثار — فرزند بھائی، زینتِ پہلو، وفا شعار

راحت رسانِ مطیع، نمودار و نامدار — جرّار، یادگارِ پدر، فخرِ روزگار

صفدر ہے شیر دل ہے بہادر ہے نیک ہے
بے مثل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو فاضل شاعر کے تمام شاعرانہ خیالات نیچرل فلاسفی سے مرتب ہیں۔ اس بند میں شاعرِ نازک خیال کی معجز نگاری قابلِ غور ہے۔ جنابِ زینبؑ نے چھوٹے بھائی کی تعریف کے متعلق جتنے لفظ استعمال فرمائے ہیں وہ سب تعداد میں اُنیس ہیں اور اُن سب میں ایک بھی ایسی صفت نہیں جو صفتِ اضافی یا مبالغۂ شاعرانہ پر محمول کی جائے۔ ایک بہن کے دو بھائی ہیں مگر امام حسینؑ اور جنابِ عباسؑ میں جو فرق ہے وہ اس مدح سرائی سے اربابِ تحقیق پر واضح ہو جاتا ہے اور صاحبانِ بصیرت خاندانِ امامت کے مدارج سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور پھر چھٹے مصرع نے پانچوں مصرعوں پر فوقیت پیدا کی ہے یعنی فرداً فرداً ان اوصاف کے جمع ہونے پر (بے مثل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے)، اس مصرع نے ترقی کا عنوان ظاہر کیا ہے اور یہی نازک خیالیاں ہیں جن سے میر انیس کی شاعری نے خاص نوعیت پیدا کی ہے۔

گرمیِ روزِ عاشورہ

گرمی کا روزِ جنگ کی کیا کیجئے بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُوں کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سُرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

پہلے یہ بات ظاہر کرنے کی ضرورت ہے کہ شاعر نے محض اظہارِ شاعری کے لئے یہ سبجیکٹ نہیں لیا ہے جس طرح خیالی داستانوں یا مثنویوں میں ایک فرضی مبحث قائم کرکے تشبیہ و استعارات

کی رنگینیاں دکھائی جاتی ہیں، اُس سے قطع نظر کرکے اس مقام پر محض واردات و مرویات سے تعلق پیدا کیا ہے۔ کتبِ معتبرۂ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ روزِ عاشورہ کی گرمی کی مثال معرکۂ کربلا سے قبل و بعد کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی جس میں مصالحِ قدرت کے رازوں کی جھلک ہے، واقعۂ اصلی بیان کرنے میں اگر صنعتِ مبالغہ کو شاعر کہیں مصرف میں لایا ہے تو اس بات کو مطالبِ حدیث سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ فنِ شاعری سے تعلق ہے اور یہ تخیل ضمنی ہے۔ اتنا ظاہر کر دینے کے بعد اب ہم مقاصدِ اصلی کی جانب رجوع ہوتے ہیں، اس بند کے تین مصرعوں میں شدتِ گرما کی تمہید کے بعد چوتھا مصرعہ ایک منظرِ واقعی ہے۔ شدتِ گرمی اور تمازتِ آفتاب میں افراطِ حرارت سے زمین کا سُرخ ہو جانا اور بخاراتِ ارضی کے صعود سے عالمِ بالا پر زردی کا پہنچنا یہ قدرتی سین دکھایا گیا ہے اس شاعری کی نزاکت سوائے اس کے کہ جس کے دل میں نیچرل مذاق کا احساس ہو دوسرا محسوس نہیں کر سکتا۔ بیت میں گرمی کی ایک کیفیت کے بیان کرنے ہی پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ لوازمِ شاعری کے تصرف سے عناصرِ اربع کو جمع کر دیا ہے۔ آب و خاک و باد و آتش گویا فصلی تغیر نے عناصر میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ مصرعوں کی سجاوٹ میں بے تکلف لفظوں کا استعمال صنائعِ شاعری کے رازوں کو کھلنے نہیں دیتا اور مقتضائے فصاحت بھی یہی ہے کہ اجتماعِ الفاظ سے صنعتِ مراعات النظیر وغیرہ کے لئے کوئی خاص کوششِ ممیز نہ ہو۔

وہ لوں وہ آفتاب کی حدّت وہ تاب و تب	کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب	خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

مضامینِ شاعرانہ سے زیادہ قوتِ تخیل مضامینِ قدرتی کی جانب مائل ہوتی ہے دوسرے مصرعہ میں حدتِ تموزِ آفتاب سے زمین و آسمان کے خلاء میں تیرگی پیدا ہونا ایک عجیب

حکیمانہ تحقیق ہے۔ جب دھوپ کڑی ہوتی ہے تو اُس کے جسم کی غلاظت سے ایک قسم کا سایہ پیدا ہوجاتا ہے، اُس سایہ سے دن کا کالا ہونا شاعر کی مراد ہے۔ تیسرے مصرع میں ساحل کا خشک ہونا ایک معمولی خیالِ شاعری ہے جس کو اکثر شعراء متقدمین لکھ گئے ہیں مگر ساحل کو لبِ نہر علقمہ بناکر اس استعارہ سے علامتِ شدتِ تشنگی کو ثابت کرنا میر انیس کا ذاتی مضمون ہے۔ مضامینِ مستعملہ قدما کو بھی نئے قالب میں ڈھالتے ہیں اور اپنی شاعری کی نوعیت ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس مرثیہ میں گرمی کا بیان ایسا لکھا ہے کہ ایک ایک مصرع قابلِ تنقید ہے مگر بخیالِ طول اجمالاً ذکر کروں گا۔

کوسوں کسی شجر میں نہ گُل تھے نہ برگ و بار — ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گُل نہ لہکتا تھا سبزہ زار — کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ باردار
گرمی وہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

اس بند میں مناسباتِ لفظی و صنعتِ مراعات النظیر کے علاوہ مرثیت کا کس قدر لحاظ رکھا ہے۔ یعنی گرمی کے بیان کے ساتھ ساتھ ہر چیز سے حزن و ملال کا عالم پیدا ہو رہا ہے جو مقتضائے وقت اور بنیادِ مرثیت ہے۔

سُرخی اُڑی تھی پھول سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوئیں میں اُترا تھا سایہ کی چاہ سے

نیچرل شاعری میں فصاحت اور سادگیِ زبان میں معنی خیزی اور بلندیِ مضامین قابلِ غور اور باعثِ کمال ہے۔

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منھ نکالتے تھے سبزہ زار سے

دونوں مصرعوں میں جنگل کی گرمی کا سین کھینچا ہے۔ درحقیقت ایسا ہی ہوتا ہے۔ عجب حیرت

کی بات ہے کہ فاضل شاعر کی شاعری واقعات کی پابند ہو کر بھی اپنی دلفریبی کم نہیں ہونے دیتی۔

آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

پہلا مصرع مضامینِ ذاتی کا نمونہ اور پھر مسئلۂ فلسفۂ شدتِ گرمی میں ہوا بند ہونے کی وجہ سے زمین کے غبار کا بلندی پر چڑھ کر بند ہو جانا اور اس سے آفتاب کی نورانی حالت میں تکدر پیدا ہونا یہ سب مناظرِ قدرت ہیں۔ دوسرے مصرع میں بخار سے مراد بخارِ ارضی ہے یعنی بخاراتِ ارضی کے صعود سے آسمان کو تپ چڑھی تھی فلسفیانہ خیال ہے۔

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

یہ ترجمۂ حدیث ہے جس پر نا واقفوں کو مبالغہ کا وہم پیدا ہو جاتا ہے اور جو علمِ تاریخ سے بے خبر ہیں اس قسم کے مضامین پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں میر انیس کی نظموں میں بہ سبب حُسنِ بیان و فصاحتِ زبان ضمنی اور واقعی باتوں میں کم امتیاز ہوتا ہے۔

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں | انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں | تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

اس بند میں فاضل شاعر نے قوتِ بلاغت دکھائی ہے، دیکھو اپنے اندازِ شاعری سے قطع نظر کر کے جب وہ تشبیہہ و استعارہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو اس میں بھی کس قدر بلند جاتے ہیں اور باوجودِ بلند پروازی کسی جگہ کلام میں اغلاق و معنی بندی کا بھدا پن نہیں پایا جاتا۔ اس کے آگے کے دو بند اور اسی انداز کے ہیں۔

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب تب کی تاب　　چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب　　کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ سب کچھ کہہ سکتے تھے اور ہر رنگ پر قادر تھے اور ان کی تصنیفات سے کم و بیش ہر رنگ کے نمونے اقتباس کئے جا سکتے ہیں مگر ہر رنگ میں اُن کی شاعری کا مدار فلسفۂ قدرت کے اصول پر ہے۔

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور　　جنگل میں اڑتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر

یہ اضطراری حالت ایک اصلی نظارا ہے کہ ایسی شدت کی گرمی میں پرند ایک مقام پر اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے۔

مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر　　خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں،

معلوماتِ علمی اور قادر الکلامی کی یہ کیفیت ہے کہ ہر استعارہ اپنی بلاغت کو فصاحت کے لباس میں پیش کرتا ہے۔

اُس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ اُمم　　نہ دامنِ رسولؐ تھا نہ سایۂ علم
اُودے تھے لب زبان میں کانٹے کمر میں خم　　شعلے جگر سے آہ کے اُٹھتے تھے دمبدم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

بس یہ میر انیس ہی ہیں کسی اور قلم میں یہ طاقت نہیں کہ امامِ مظلوم کی تصویر اس طرح کھینچ سکے مرثیت جس کا نام ہے مضامین آفرینیوں میں بھی وہ پہلو چھوٹنے نہیں پاتا اور کس حسن

سے مقاصدِ مرثیت کی جانب گریز کرتے ہیں۔ ہر اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ خدا کا ہاتھ کام کرتا تھا اور جو باغِ خلد کے روح افزا پھول اُن کو ملتے تھے وہ خاندانِ رسالتؐ کے مقدس مزاروں پر چڑھا دیتے تھے۔ یہ تمازتِ آفتاب اور یہ گرمی کی شدت یہ قحطِ آب اور یہ انقلاب سب امام حسینؑ ہی کے لئے تھا یہ بات براعتِ استہلال سے پیدا ہے اور پہلا مصرع یہ راز ظاہر کر رہا ہے دوسرے مصرع سے ثابت ہے کہ عظمت و جبروتِ شانِ امامت کا مقتضا یہی تھا کہ سید الشہداؑ کے لئے یہی دو متبرک چیزیں سایہ کرنے والی تجویز کی جاتیں دامنِ رسول و سایۂ علم اور ان دونوں کے نہ موجود ہونے سے حسینِ مظلومؑ کی مظلومی اور بےکسی کا اظہار ہے۔ بیت میں پانچویں مصرع کا قافیہ ممکن نہیں کہ کوئی نازک خیال شاعر اس سے بہتر پیدا کر سکے۔ وہ اہلِ ولا کہ جن کو رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے دلی محبت ہے اس ایک بند کے مضمونِ حسرت و یاس سے اُس راہِ خدا میں سر دینے والے کی ہمت و شجاعت کا اندازہ کرلیں گے۔

اظہارِ اختیاراتِ امامت

کہہ دوں تو خوان لے کے خود آئیں ابھی خلیلؑ   چاہوں تو سلسبیل کو دم میں کروں سبیل
کیا جام آب کا ہمیں تو دے گا او ذلیل   بے آبرو خسیس ستمگر دنی بخیل

جس پھول پر پڑے ترا سایہ وہ بُو نہ دے
کھلوائے فصد تُو تو کبھی رگ لہو نہ دے

کہہ دوں اور چاہوں دو مصرعوں میں دو مقابلہ کے لفظ جمع ہوئے ہیں۔ دیکھنے میں تو معمولی لفظ ہیں مگر تحکم و استغنا کی شان دکھانے کو جامع اور محیط ہیں۔ چوتھے مصرع میں بخل و خست کی ہجو کر کے بیت میں دنائتِ طبیعت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ پورے بند میں بلاغت و فصاحت

کو سمویا ہے۔ چھٹے مصرع کا مضمون بالکل اچھوتا ہے۔

تلوار کا میان سے نکلنا

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جُدا — جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جُدا
مہتاب سے شعاع جُدا، گُل سے بُو جُدا — سینے سے دم جُدا رگِ جاں سے لہو جُدا

گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلی نکل پڑی

اس حالت کو متعدد مرثیوں میں نظم فرمایا ہے مگر افراطِ مضامین خداداد ہے۔ فصاحت آگینی اور مناسباتِ لفظی کے ساتھ ساتھ ہر جگہ نئی تشبیہوں سے کام لیا ہے اس بند میں افتراق کی جتنی چیزیں مشبہ بہ ہیں ان سب کو باہم مفارقت کے لئے کتنی سرعت و نزاکت کی ضرورت ہے یہ شاعر کا مقصود ہے اور پورا بند تغزل کے گہرے رنگ میں رنگا گیا ہے۔ کہنہ مشق شاعروں کی غزلوں میں بھی ایسے دلفریب لفظوں کی بے چینیاں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

تلوار کی تعریف

گرمی میں برقِ تیغ جو چمکی شرر اُڑے — جھونکا چلا ہوا کا جو سن سے تو سر اُڑے
پرکالۂ سپر جو ادھر اور اُدھر اُڑے — رُوح الامیں نے صاف یہ جانا کہ پَر اُڑے

ظاہر نشانِ اسمِ ہزیمت اثر ہوئے
جن پر علی لکھا تھا وہی پر سپر ہوئے

تصنیف میں جس قدر محاسن ہیں۔ تنقید کے لئے اُتنے لفظ بھی تلاش کرنا غیر ممکن ہے۔

قافیہ کے ساتھ ردیفوں کا تعلق اور با محل تصرف میر مرحوم کا حصّہ ہے کوئی ردیف قافیہ سے غیر مانوس نہیں معلوم ہوتی جو ضرورتِ شعری کے لئے بے ربطی ظاہر کرے۔

آئی چمک کے غول پہ جب اسر گرا گئی | دم میں جمی صفوں کو برابر گرا گئی
ایک ایک قصرِ تن کو زمیں پر گرا گئی | سیل آئی زور شور سے اور گھر گرا گئی

آ پہنچا اُس کے گھاٹ پہ جو مر کے رہ گیا
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہہ گیا

مثنوی یا مرثیہ یہاں تک کہ قصیدہ یہ ایسی صنفیں ہیں جن میں معاملہ بندی کے سبب سے شعرا صرف قافیہ پر اکتفا کرتے ہیں مگر ہندوستان کا زبردست شاعر انیسؔ اس معاملہ میں مجبور نہیں۔ وہ اپنی شاعری کا مقصود ان پابندیوں میں بھی نثر کے فصیح جملوں سے زیادہ وضاحت وصراحت سے بیان کر سکتا ہے اور اُس کی قوّتِ خیال اس دشوار گذار راہ میں بھی آزادی سے کام کر رہی ہے اور کیسی کیسی شور زار زمینوں کو سیر حاصل بنا دیا ہے چوتھے مصرع سے اس بند میں بیت کو ربط ہے اور استعارہ کا خاتمہ ہو گیا ہے یہ سہل الممتنع شاعری کی مثالیں ہیں۔ سلسلۂ مناسباتِ لفظی کہیں قطع ہوتے نہیں پاتا۔ دوسرا بند بھی اُسی لگاؤ سے شروع ہوتا ہے۔ کیا خداداد قوّتِ شاعری ہے اور کیا کامل مشق ہے۔

یہ آب اور یہ شعلہ فشانی خدا کی شان | پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان
خاموش اور تیز زبانی خدا کی شان | استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان

لہرائی جب اُتر گیا دریا چڑھا ہوا
نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی بڑھا ہوا

دوسرے مصرع کی قوّت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چوتھا مصرع ہونے کا حق اسے حاصل تھا مگر کس کے لئے؟ اُس شخص کے لئے کہ جس کی ترقیٔ خیال کی کوئی حد قائم ہو۔ وہ تیسرے اور چوتھے مصرع کو بتدریج ترقی دیتے چلے گئے اور پھر اپنے عنوانِ نظم کے موافق بیت

کو چوتھے مصرع سے وابستہ کردیا۔ اس بند کے چاروں مصرعے باوجود رنگینیِ صنعتِ استعارہ، فلسفہ و نیچرت کی تشریح ہیں۔ یہ تخئیل امادی نہیں ہے اس کے لیے شاعر ایک خاص دل و دماغ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ بیت کے کئی باریک پہلو قابلِ نقادی ہیں مگر اُن پر وہی تنقید لکھ سکتا ہے جو میر انیس سا نازک خیال ہو۔ اس بیت کے متعلق پے در پے آنے والے خیالوں نے قوتِ نقادی کو منتشر کر دیا ہے اظہارِ کثرتِ محاسن کے لیے افراطِ الفاظ کی ضرورت ہے اس لیے یا ہمچمدان احسن کو اپنی بے بضاعتی اور کم علمی پر افسوس ہوتا ہے۔

دریائے آبِ ذوالفقار میں جب لہر آئی تو دریا اُتر گیا یعنی لوگوں کی نظروں سے اصلی دریا کی عظمت جاتی رہی یا دریا خود شرم سے اُتر گیا۔ پانی کا نیزوں بلند ہونا علامتِ پیمائشِ مقدارِ آب ہے اور بذریعہ صنعتِ ایہام یہ مقصود ہوگا کہ وہ ضربیں جو مخالفوں کے نیزوں پر پڑی ہیں اُن کے لیے مضمونِ واقعی ہے۔ دوسری صورت یہ بھی ہے (لہرائی جب) لہر آنا اصطلاحِ زبانِ اُردو میں شوق پیدا ہونا یعنی تلوار کو جب قتل و خونریزی کا شوق پیدا ہوا تو روانیِ آبِ شمشیر سے چڑھا ہوا دریا اُس کی نظروں سے اُتر گیا کیوں کہ اس کا پانی امام حسینؑ کی قوتِ اعجازی سے نیزوں بڑھ گیا تھا اب چوتھے مصرع سے اس بیت کے مضمون کو متعلق کیجیے تو اور کچھ لطف پیدا ہوتا ہے ؏

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان

آبِ استادہ اور آبِ بہتا یالی تو متضاد صفتیں ہیں مگر لہر آنے سے روانی پیدا ہوتی ہے کیوں کہ لہر آنا پانی کا متحرک ہونا ہے اور متحرک ہونا جوش سے مراد ہے پس یہ نازک مفہوم قابلِ غورِ اربابِ کمال ہے جس کے بیان کو الفاظ نہیں ملتے اور بھی ایک نازک پہلو خیال میں آتا ہے یعنی دریا میں جب پیچ و تاب پیدا ہوا اور دریا کو لہر آئی تو طوفانِ آبِ تیغ کا نظارہ کر کے دریا شرمندہ ہو کر گھٹ گیا یا اُتر گیا اس وجہ سے کہ ذوالفقار کا پانی نیزوں چڑھا ہوا تھا اور دریا اس ترقی سے مجبور تھا میر انیس مرحوم کے اس مصرع کو اندازِ خواندگی سے زیادہ تعلق ہے۔ اُس کے

موشننس لفظوں میں نہیں ادا ہو سکتے خطِ قوسی، ڈیش۔ فل اسٹاپ، کاما، نقاطِ فاصل۔ ان علامات کے ذریعے سے ان اداؤں کا بیان دشوار ہے جو خواندگی سے علاقہ رکھتی ہیں اور اس خاندان کے مرثیوں کو اس خاندان کے اندازِ خواندگی سے بہت کچھ تعلق ہے۔ یہ لوگ اپنی شاعری کے جذبات قوتِ خواندگی کے ذریعے سے ظاہر کرتے ہیں اور اُن کی شاعری اس ترکیب سے مختلف معنی پیدا کرتی ہے چنانچہ میرے اُستادِ مغفور اپنے اکثر مصرعے اور بیتیں مختلف انداز سے پڑھتے تھے اور تغیرِ اندازِ خواندگی سے تغیرِ معنوی پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کی مثالیں اُن کی تصنیفات میں بہت ہیں۔ میں یہاں ایک بیت کی مثال پر اکتفا کروں گا

ہتھیار پھینک پھینک کے بھاگے لڑائی سے
تیغیں تو اپنی آکے اُٹھا لو ترائی سے

صورتِ اوّل تو ظاہر ہے کہ امام حسینؑ بھاگنے والے مخالفوں سے رحیمانہ خطاب فرماتے ہیں اور اُن کی نامردی اور بزدلی پر نفرت کر کے اجازت دیتے ہیں کہ جو ہتھیار تم چھوڑ کر بھاگ گئے ہو وہ تو اُٹھا لے جاؤ اور دوسرے اندازِ خواندگی سے بالکل اس کے خلاف معنی پیدا کئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ گویا اس وقت تک اس خطاب میں انتقام کی جھلک ہے اور سید الشہداؑ کا غصہ فرو نہیں ہوا اس لئے فرماتے ہیں کہ اگر بہادر ہو تو جو تیغیں فراری کی حالت میں چھوڑ گئے ہو بھلا اُن کو تو اُٹھا لو یعنی ممکن نہیں کہ اُٹھائے جا سکو۔ اگر ہمارے سامنے وہ اس بیت کو دونوں صورتوں سے نہ پڑھ چکے ہوتے اور ہم بجائے خود مرثیہ میں اس مقام پر نظر ڈالتے تو ہمارا ذہن کبھی اس باریکی کی جانب منتقل نہ ہوتا۔ اسی طرح اُن کے مورثِ اعلیٰ مجددِ مرثیہ گوئی کی تصنیف ایسے رازوں سے بھری پڑی ہے۔ درحقیقت اظہارِ جذباتِ شاعری بغیر تصرفِ علمِ اشارات[1] غیر ممکن ہے۔

---

[1] علمِ اشارات میں نے یہاں موشننس کا ترجمہ کیا ہے۔

آیا خدا کا قہر جد ھر سن سے آگئی　　کانوں میں الاماں کی صدا رَن سے آگئی
دو کرکے خود زین پہ جوشن سے آگئی　　کھنچتی ہوئی زمین پہ تَوسَن سے آگئی
بجلی گری جو خاک پہ تیغِ جناب کی
آئی صدا زمین سے یا بُو تراب کی

درحقیقت معرکۂ جلالِ امامِ حسینؑ قہرِ خدا ہی تھا کیوں کہ اس معرکہ میں سیدالشہدا پابندِ رضائے الٰہی تھے اور حکمِ جہاد منجانب اللہ تھا۔ اس صورت میں حضرتؑ کی ہر ضرب کو قہرِ خدا سے تعبیر کرنا اصلی خیال ہے اور قہرِ خدا سے امان مانگنا بھی فرض ہے اس کا گواہ مصرعِ ثانی ہے۔ تیسرے چوتھے مصرع میں کس التزام سے بتدریج تلوار کے کاٹ کی تفصیل فرماتے ہیں اور زمین تک پہنچ کر منادی کی خوبی پانچویں مصرع کے ایک لفظ سے ظاہر ہے یعنی خاک۔ صنعتِ ایہام کی نزاکت دیکھیے۔

لشکرِ اعدا کے ایک پہلوان کی تصویر

بالا قد و کلفت و تنو مند و خیرہ سر　　روئیں تن و سیاہ دروں آہنیں کمر
ناوک، پیام مرگ کا ترکش اجل کا گھر　　تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

فصاحتِ خداداد کا یہ ثبوت ہے کہ حسبِ پیمائشِ اصولِ عروض صدر و ابتدا عروض وضرب وغیرہ کے ٹکڑوں کی ترتیب میں کہیں جھول پیدا نہیں ہوتا اور حتی الوسع حرفوں کا دبنا اور گرنا بھی وہ مکروہ سمجھتے ہیں خواہ ایسے ہی حرف کیوں نہ ہوں جن کا سقوط عروضیوں کے نزدیک جائز ہے۔ بڑے بڑے فصیح البیان اس میدان میں مجبور ہو جاتے ہیں اور اول سے آخر تک کسی نظم کو ایک پایہ کا ثابت کرکے دکھانا جس سے عجزِ طبیعت اور کمزوریِ تصنیف ظاہر نہ ہو بڑی

قوت دار لکڑوں کا کام ہے۔

میر انیسؔ نے اکثر مرثیوں میں ایسی مصوری کی ہے اور بدباطن دشمن اسلام مگر قوی اور کریہہ منظر پہلوانوں کا کیرکٹر لکھنے کے وقت اُن کے خصائل و خصائص کی نوعیت دکھانے میں اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کی ہے اور ہر جگہ مدح یا ذم دجو کچھ اس کو کہہ سکیں، کے نئے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ اُن کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اُن کو اردو زبان پر کافی عبور تھا۔ اُن کے کلام میں تلاش کئے جائیں تو بہت لفظ ایسے ملیں گے جو بالکل اچھوتے ہیں اور اُس بادشاہِ سخن کا جاری کیا ہوا سکہ۔

تفاخرِ شاعرانہ

کھنچ جائے شکلِ حرب وہ تدبیر چاہیئے　　حاسد بھی سب مُقر ہوں وہ تقریر چاہیئے

تیزی زباں میں صورتِ شمشیر چاہیئے　　فولاد کا قلم دمِ تحریر چاہیئے

نقشہ کھنچے گا صاف دمِ کارزار کا

پانی دوات چاہتی ہے ذوالفقار کا

اس بند میں شاعرانہ بلند پروازی، جدتِ مضامین، رنگینیِ خیالات کی خوبیاں ہیں اور اس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور اپنے رنگ میں لکھ بھی سکتا ہے۔ میں اُن مقاموں پر زیادہ زور دینا چاہتا ہوں جہاں میر انیسؔ نے اپنی ذاتی اور فطری شاعری سے کام لیا ہے اور محاسنِ زبانِ اردو کو سہل الممتنع شاعری میں برتا ہے اور باوجود سادگیِ نظم اب تک اُس سلمائے شاعری کا حُسنِ دلفریب زیرِ نقاب ہے۔

ندائے غیب

بس اب نہ کر وغا کی ہوس اے حسینؑ بس ۔۔۔ دم لے ہوا ہیں چند نفس اے حسینؑ بس
گرمی سے ہانپتا ہے فرس اے حسینؑ بس ۔۔۔ وقتِ نمازِ عصر ہے بس اے حسینؑ بس

پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں اژدحام میں
اب اہتمام چاہیئے اُمّت کے کام میں

دنیا میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو امام کے جذباتِ شجاعت کو روک سکے سوائے اس حکم کے کہ جس کی تعمیل میں سید الشہداء نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں اور پیارے عزیزوں کی قربانی چڑھائی۔ یہ ایک مضمونِ حدیث ہے اب میر انیسؔ کے اثراتِ الفاظ پر نظر ڈالو اور عالمِ روحانی کا مشاہدہ کرو تو اس آواز کا اثر مجبور کرتا ہے کہ ملائکہ مقدس کی صدائیں میر انیس کے لب و لہجہ میں اُتر آئی ہیں۔ بس ایک پابندِ اعمالِ صالح کے لئے فضیلتِ وقتِ نماز کا ضائع ہونا کس قدر مکلف و موذی خیال ہے جس نے شجاعِ عرب کے غیظ و غضب پر غالب آکر تعمیلِ حکم کی جانب موڑ کر دیا اور جو تلوار ابھی ملک الموت کو مدد دے رہی تھی نیام میں رکھ لی گئی اور جو ہاتھ چند منٹ پیشتر شجاعت کی اعجازی طاقت دکھانے میں مصروف تھے بکمال ادب معبودِ حقیقی کی درگاہ میں مغفرتِ اُمّت کے لئے مصروفِ دُعا ہو گئے۔ اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد
اس مقام کو ہر شاعر یا مرثیہ گو حسبِ واقعۂ اصلی لکھنے پر مجبور ہو گا مگر یہ خیال اور یہ لفظ اس کو نہیں مل سکتے جو ایک مجاہدِ مظلوم کی آخر وقت کی تصویر دکھانے کا آئینہ ہیں اور میر انیس کے الفاظ میں آسمانی تاثیر کی روح پھونکی گئی ہے۔ اب میں وہ غم انگیز نظارہ دکھاتا ہوں جس پر ملائکِ مقدسِ آسمانی نے بھی خون کے آنسو بہائے ہیں۔

جنگل سے آئی فاطمہؑ زہرا کی یہ صدا ۔۔۔ اُمّت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمدا

اس وقت کون حقِ محبت کرے ادا　　　بے ہے یہ ظلم اور دو عالم کا مقتدا

اُنیس سو ہیں زخم تنِ چاک چاک پر

زینبؑ نکل حسینؑ تڑپتا ہے خاک پر

الفاظِ استغاثہ کی قوّت وتاثیر کو صرف وہی لوگ امتیاز کر سکتے ہیں جو نزاکتِ زباں کے بیش بہا جواہر کے پرکھنے والے ہیں مگر چھٹے مصرع کا اثر کن لفظوں میں بیان کروں، یہ میرے امکان سے باہر ہے اس مصرع میں میر انیسؔ کے الفاظ خود پکار رہے ہیں کہ کوئی درد رسیدہ ماں اپنے پیارے مگر مظلوم و بے کس فرزند کی امداد کے لئے استغاثہ کرتی ہے اور اس استغاثہ میں جنابِ زینبؑ کو مخاطب کرنا ایک قدرتی اصول کا دکھانا ہے کہ اس وقت واماندگانِ معرکۂ کربلا میں سید الشہداؑ سے محبت کا تعلق رکھنے والے زن و مرد میں کون کون باقی تھا۔ سلسلۂ کلام اور ترتیبِ واقعات کے قائم رکھنے کے لئے دوسرے بند میں امامِ مظلومؑ کی عاشقِ زار بہن کے اضطرابِ اضطرارِ دل کا نقشہ کھینچا ہے اور مضطرب الحال بہن نے بھائی کی لاش تک پہنچنے کے لئے والدۂ مقدسہ کے حکم کی تعمیل کس صورت اور حالت سے کی ہے۔

پردہ اُلٹ کے بنتِ علیؑ نکلی ننگے سر　　　لرزاں قدم خمیدہ کمر غرقِ خوں جگر

چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر　　　لے کربلا بتا ترا مہمان ہے کدھر

اماں قدم اب اُٹھتے نہیں تشنہ کام کے

پہنچا دو لاش تک مرے ہاتھوں کو تھام کے

چوتھے مصرع کا مقصود عجب رقت خیز ہے۔ میر انیس جس میدان میں شاعری کرتے ہیں اُس کی وسعت دکھاتے ہیں، چونکہ یہ موقع بین کا ہے اس لئے لفظوں میں وہ اثر بھر دیا ہے جس سے اہلِ دل کا قلب قابو میں نہیں رہ سکتا، کربلا میں کسی مسلمان کی حمیتِ انسانی اس قابل نہ تھی کہ وہ امام حسینؑ کی خدمتِ مہمانی سے مخاطب کیا جاتا ۔۔۔ اس لئے کربلا یا زمینِ کربلا کو مخاطب فرماتے ہیں اور اس خطاب سے قدرتی مظلومی اور بے کسی کا اظہار کیا ہے۔ بیت میں بندِ اول

کے چھٹے مصرع کا جواب ہے اور یہ التزام میر انیس کا حصہ ہے۔

خاتمہ

بس اے انیس ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم میں یادگار رہیں گے یہ چند بند
ٹپکے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند لفظ ہیں سلطاں پسند بند
یہ فصل اور یہ بزم عزا یادگار ہے
پیری ہے کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

اس بند میں اپنے طرزِ شاعری کا ایک لفظ استعمال فرمایا ہے یعنی "ٹپکے" باوجودیکہ اس مقام پر نکلے بھی ایک ہم وزن لفظ موجود تھا اور کیا عجب ہے کہ کوئی دوسرا شاعر نکلے ہی لکھتا مگر میر انیس کا مابہ الامتیاز فرق باقی نہ رہتا۔ یہ فصل یعنی فصلِ پیری، پیری کی طاقتیں اور اس کے مقابل گھر یا خزاں کی بہار یہ تلاشِ انیس ہے۔ اب مرثیے کے ہر مقام کی قوت دیکھنا چاہیے کہ کسی جگہ دل و دماغ میں ضعف و عجز پیدا ہونے نہیں پاتا۔ اکثر شعرا کا رنگِ طبیعت کسی خاص (سبجیکٹ) پر زور دکھاتا ہے مگر میر انیس کا قلم ہر رنگ میں فصاحت کے چمن کھلاتا ہے۔ میر انیس کا مرثیہ مطلع سے مقطع تک وہ جواہر نگار ہار ہے جس میں کسی سلیقہ شعار سادہ کار نے مختلف جواہر کو حسبِ موقع نصب کر دیا ہے اور وہ گلدستہ ہے جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول کام میں لائے گئے ہیں مگر بحیثیتِ مجموعی ہر ہر پھول بجائے خود دلفریب ہے۔

دوسرے مرثیے کا انتخاب

اس مرثیے کے عنوان میں ابوالفضل عباسؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کی حالت کی تصویر

کھینچی ہے۔

سیدھی نہیں ہوئی ابھی ٹوٹی ہوئی کمر — بھائی وہ مر چکا ہے کہ تھا جس کے دم سے گھر
نوکوں میں برچھیوں کے ہے شبیر کا جگر — اب طالبِ رضائے وغا ہے جواں پسر
پیری میں اس جواں کو بھی کھوئیں تو کیا کریں
کیوں منصفو کہو جو نہ روئیں تو کیا کریں

خیمے کو تکنے لگتے ہیں منھ پھیر کے حسینؑ — بڑھتا ہے ہاتھ جوڑ کے جب شہ کا نورِ عین

ان دونوں مصرعوں میں ایک سین دکھایا گیا ہے جس کو موشنس (علمِ اشارات) سے تعلق ہے اور یہ وہ نکتہ ہے جس پر آج یورپ کے فسانہ نگاروں کو ناز ہے۔ جب جنابِ علی اکبرؑ با ارادۂ رضائے جہاد بڑھتے ہیں تو سید الشہداؑ اپنے فرزند کی توجہ دوسری جانب مائل کرنے کے لئے خیمہ کی جانب تکنے لگتے ہیں۔ تیسرے مصرع میں امامِ مظلومؑ کے خیال کی ترجیح ہے اور چوتھے مصرع میں شاعری کا نازک پہلو پیدا ہوا ہے۔ لفظ (عباسؑ) پر زور دینے سے یہ مقصود ہے کہ عباسؑ کی مرگ سے تو اہلبیتؑ کی یہ حالت ہے۔ اب اگر تم شہید ہوئے تو کیا حال ہوگا۔ اس صورت میں (یہ) کا لفظ اسم اشارہ سمجھا جائے گا اور اگر (یہ) کا لفظ کلمۂ استعجاب سمجھا جائے تو تغیرِ معنوی ہو کر شاعری ایک دوسرا رُخ پیدا کرتی ہے یعنی اس کثرت سے رنج و ملال اہلبیتؑ پر طاری ہے کہ تمہاری مفارقت کسی کو گوارا نہ ہوگی۔ پھر بیت میں اس خیال کا دفعِ دخل فرماتے ہیں۔

بھائی جہاں سے جانبِ خلدِ بریں گئے
پرسے کو بھی چچی کے تم اب تک نہیں گئے

بہرکیف جنابِ علی اکبرؑ کے ارادہ کا پھیرنا منظور ہے۔ شاعر نے اس بند میں عجب مسٹری دکھائی ہے جس کو ماہرانِ فن خوب سمجھ سکتے ہیں یہ خیال لفظوں میں بیان کرنے کے قابل نہیں اور نہ الفاظ جذباتِ اصلی کی تصویر کھینچ سکتے ہیں۔ یوں تو ایک سادہ بند ہے جس میں رنگینیٔ مضامین اور تکلفاتِ شاعری کو بالکل دخل نہیں مگر میر انیسؔ اسی تخئیل سے میر انیسؔ کہلائے اور انہیں

نازک خیالیوں نے کلام کو گراں قدر بناکر مقبولِ خاص و عام کرایا عام اس سے کہ کوئی قوت امتیاز یہ ان باریکیوں تک پہنچے یا نہ پہنچے مگر یہ سُریلا نغمہ سب کے کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے، اس کے آگے اور دو بند اسی تمہید سے مسلسل ہیں اور یہ میر انیس کی شاعری کا خاصہ ہے کہ جس مبحث کو لیتے ہیں اس میں کوئی گوشہ چھوڑتے نہیں اور اُن کا اَن تھک خیال زمین و آسمان کی فضائے وسیع میں کسی جزوِ شاعری کی نسبت فرو گذاشت نہیں کرتا۔

اصغرؑ کو دیکھو عابدِ بے کس کی لو خبر

بچوں سے سب کو محبت ہوتی ہے اور یہ ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ اس لئے امام علیہ السلام کا خیال ہے کہ علی اصغرؑ کی محبت سے جنابِ علی اکبرؑ اپنی زندگی عزیز سمجھیں گے یا جنابِ زین العابدینؑ کی بیماری مانعِ رضائے جنگ ہوگی۔

رانڈوں کے تم پسر ہو یتیموں کے ہو پدر

ان دونوں صورتوں میں بھی زندگی کی ضرورت ہے۔

گھر تھامتے ہیں باپ کا ذی مرتبت پسر

ان سب اشاروں سے وہی مقصود ہے جو ایک مصرع سے پیدا تھا مگر میر انیسؔ کے جوشِ خیالات کے لئے کوئی پیمانہ مقرر نہیں۔ یہ دریائے فصاحت کی موجیں ہیں جن کا سلسلہ قطع نہیں ہوتا اور نہ کوئی ان لہروں کا شمار کر سکتا ہے۔

کس کو یہ داغ پیرِ فلک نے دیا نہیں
سر پر کسی کے باپ ہمیشہ جیا نہیں

اس بیت میں تکرارِ حرفِ دخیل سے جو فصاحت پیدا ہوگئی ہے اُس پر عموماً شعرا کی نظریں نہیں پڑتیں اور بادی النظر میں ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس التزام میں جو کاوش ہوتی ہے اُس کو مصنف کے دل سے پوچھنا چاہیئے۔

تم سے بھی کم تھے عمر میں جب ہم ہوئے یتیم　　　ماں بھی نہ تھی یہ اور تھی اک آفتِ عظیم

پر ہر بلا میں حافظ و حامی رہا کریم — ہم دونوں بھائیوں کے جگر زخم سے تھے دو نیم

رانڈوں کو یہ الم ہے کہ منھ موڑے جاتے ہیں

ہم تو جہاں میں تم سا پسر چھوڑے جاتے ہیں

معاملات میں سلسلۂ گفتگو کی شائستگی اور حالتِ اضطرار میں قابلِ تسکین تفہیم جس سے دلجمعیِ کامل کا اظہار ہو اور مضامینِ عالی میں بلند خیالی یہ میر انیسؔ کی خدمت تھی۔ انہوں نے اپنے فرائض کو پورا ادا کیا قسامِ ازل نے اُن کی زبان کو چشمۂ کوثر سے طاہر و مطہر کیا تھا اور وہ وہاں سے اس منصب پر مامور ہو کر آئے تھے اور یہ کار پردازانِ قضا و قدر کا انتخاب تھا، پھر اُن کی تعریف انسانی طاقت سے باہر ہے۔ یہاں فقط ہنگامۂ رخصتِ جنابِ علی اکبرؑ میں میر انیس نے اپنی زبان کے جوہر دکھائے ہیں۔ اور چھٹے مصرع سے دوسرے بند کا مصرعِ اوّل متعلق کر کے خاندانِ امامت کا لٹریچر دکھایا ہے۔ یہاں ایک باریک پہلو کی جانب ناظرین کی توجہ مائل کروں گا۔ کوئی باپ بیٹے کے منہ پر بیٹے کی تعریف نہیں کر سکتا اور نہ کوئی فرزندِ رشید باپ کی زبان سے اپنی مدح سرائی کے قصیدے سُن کر خوش ہو سکتا ہے۔ یہ بات کسی قدر تہذیب و اخلاق کی شان سے علیحدہ ہے مگر یہ رازداری قابلِ لحاظ ہے کہ سچی تعریف جو بیٹے کے لئے قابلِ تسلیم اور باپ کے لئے باعثِ افتخار ہے اور اس تقریر سے مقصود پیدا کیا گیا ہے۔

کنبے کی جان، باپ کا اقبال، گھر کا نور

یوسف جمال، صاحبِ توقیر، ذی شعور

دونوں مصرعوں میں صنعتِ تقابل بھی موجود ہے۔ انتہائے فصاحت کے ساتھ علمِ معانی و بیان کا مذاق چھوٹنے نہیں پاتا۔

جرار، بُردبار، دلاور، سخی، غیور

آنکھوں کی روشنی، جگر و قلب کا سرور

یہ وہ لفظ ہیں جو ہر شاعر کو معلوم ہیں مگر ضرورت کے وقت میر انیس ہی کے قبضۂ قدرت میں

رہے تھا خورد و کلاں کو ارجِ سعادت حصول ہیں۔ پانچواں مصرع ظاہر کرتا ہے کہ خود امام علیہ السلام کو بھی دیدارِ جنابِ علی اکبر باعثِ فخر و سعادت تھا تو اس صورت میں مرتبۂ امامت اور عظمتِ بزرگی کو نقصان پہنچتا ہے مگر چھٹے مصرع میں معجز نگار شاعر نے اپنی الہامی تخیل سے یہ راز آشکارا کر دیا ہے سے تم ہو تو اہلبیت میں گویا رسولؐ ہیں۔

نعمت ہے زلیت خلق میں ایسے سعید کی   پیدا ہے نورِ رخ سے ضیا صبحِ عید کی
ہے سب کو آرزو رُخِ روشن کی دید کی   تصویر ہو رسولِ خدائے مجید کی

کیوں کر جُدا نگاہ سے بیٹا کریں تمہیں
آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمہیں

واقعاتِ اصلی اور محبتِ پدری کو کیا شاعرانہ رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں اور بیت میں تو زبان کی دلفریبی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ قافیوں کا تعلق ردیف سے   جزوِ لاینفک ہے۔ باپ کی زبان سے محبت میں ڈوبے ہوئے لفظ میر انیس نے فصاحتِ خداداد کی سان پر چڑھائے ہیں۔

راحت کے دن ہیں آمدِ فصلِ شباب ہے
پہلا ابھی کتابِ جوانی کا باب ہے

شاعری کا مذاقِ سلیم تشبیہہ و استعارہ میں بھی موجود ہے۔ یورپ کے فسانہ نگاروں نے یہ خیال اپنے ناولوں میں جا بجا صرف کیا ہے اور ایسے ایسے فقرے انگریزی لٹریچر میں بیش بہا جواہر سمجھے جاتے ہیں مگر میر انیس کی نظموں میں سب کچھ مل سکتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو انیس اور ازیل لارڈ لٹن کی تخیل کا فرق دیکھو۔ یورپ کا ناولسٹ کہتا ہے کہ ہماری ہیروئن کے صحیفۂ عمر کا اٹھارھواں باب شروع تھا جس سے مراد ہے کہ اس حسینہ کی اٹھارہ سال کی عمر تھی اور میر انیس کے خیال میں یہ افضلیت ہے کہ عالمِ شباب کے اٹھارہ سال پورے ہونے پر بھی کتابِ جوانی کا پہلا باب شروع تھا۔ اس کا نام ہے نازک خیالی، جدت، ترقی۔

اکبر تمہاری قدر نہیں ہے کسی کو آہ
اس حسن کا بشر نہیں دیکھا خدا گواہ
ہوتے جو لوگ احمدِ مرسلؐ کے خیر خواہ
تم کو سمجھتے ثانیِ پیغمبرِ الٰہ،

یہ سلسلہ اُس تقریر سے متعلق ہے جس سے بحث کی جا رہی ہے۔ مگر تیسرے مصرعہ میں ایک اشارے سے مرثیت پیدا ہوئی ہے یعنی تمام معرکۂ کربلا میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو خیر خواہِ رسولؐ ہوتا اور جنابِ علی اکبرؑ کو ہم شکلِ رسولؐ سمجھ کر اُن کی عزت اور قدر کرتا۔ یہ خیال امام علیہ السلام کی مجبوری اور بے کسی پر دلیلِ قاطع ہے۔ وہ جادۂ حق سے منحرف تھے جو خونِ ناحقِ شہدائے کربلا کا مظلمہ روزِ جزا کے لئے اپنی گردنوں پر لے گئے اور حرص و طمع کی طوفان خیز آندھیوں نے چراغِ امامت گل کر دیا۔ اللّٰہم اخفظنا۔ امام علیہ السلام نے جس فصاحت کے ساتھ فرزندِ رشید کی تعریف کا خطبہ پڑھا ہے اُس کا جواب جنابِ علی اکبرؑ کی زبان سے سُن کر کوئی منصف مزاج فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کون حق پر ہے اور کس کی طرفداری کی جائے۔

اکبرؑ کا رنگ اُڑ گیا سُنتے ہی یہ کلام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے شہ سے کہ یا امامؑ
فرزندِ ارجمند ہیں سجّادِ نیک نام
اکبرؑ تو ہے حضور کا ادنیٰ سا اک غلام

اس امر سے فزوں کوئی شرمندگی نہیں
آقا کے بعد موت ہے پھر زندگی نہیں

پس ضرورت یہاں تک تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ جنابِ علی اکبرؑ نے اپنی خواہش کے موافق پدرِ بزرگوار کو جواب دے دیا اور ارادۂ مرگ ظاہر کر دیا مگر میر انیسؔ کا قلم جس سلسلہ کو اٹھاتا ہے فصاحت و بلاغت کے باغ لگاتا ہے۔ جو سخن آفرینیاں اور نازک خیالیاں اس تقریر کے سلسلہ میں سید الشہدا کی زبان سے دکھائی گئی ہیں اُن سے زیادہ جنابِ علی اکبرؑ کے جواب میں موجود ہیں۔ حفظِ مراتبِ پدری، رنگینیِ خیالات، جدتِ مضامین، بلاغت تشبیہ و استعارہ، اور پھر میر انیسؔ کی زبان ا

بندے ہزار ہم سے نثارِ سرِ حضورؐ
دُنیا ہوا اور آپ ہوں اے کبریا کے نُور
روشن جو ہے جہاں اسی دم کا ہے سب ظہور
ذرّہ ہر اک ہے نورِ قدم سے چراغِ طور

ظلمت زدائے خلق شہِ دیں کی ذات ہے
دنیا میں آفتاب نہ ہو جب تو رات ہے

رونق زمیں کی ہے کہ امامِ زماں ہیں آپ — سایہ ہے جس کا عرش پہ وہ آسماں ہیں آپ
ہر جہاں میں باعثِ امن و اماں ہیں آپ — شیرازۂ صحیفۂ کون و مکاں ہیں آپ

فردوں کی ابتری ہے جو دفتر کشا نہ ہو
کیوں کر بچتے جہاز اگر نا خدا نہ ہو

افضل ہے کون سبطِ رسالتمآبؐ سے — دنیا میں ہے تو یہ برکت جناب سے
سرسبز ہے زراعتِ عالم سحاب سے — ذرّوں کی زندگی ہے فقط آفتاب سے

چھٹ کر پدر سے باپ کے پیارے کہاں رہیں
جب آسماں نہ ہو تو ستارے کہاں رہیں

دم سے حضور کے ہے غلاموں کی ہست و بود — مولا ہیں اس جہان میں درِ رحمت و درود
اے چشمۂ عطا و کرم، بحرِ فیض و جود — دریا اگر نہ ہو تو حبابوں کی کیا نمود

سب خلق شاہِ دیں سے طلب گارِ عون ہے
جب نوحؑ غرقِ خوں ہو تو کشتی کا کون ہے

ہر بیت کی تشبیہ کی خوبی اور ہر ایک مثال کی جدّت قابلِ غور ہے۔ خیال ایک ہی ہے مگر مختلف پیرایہ میں تشبیہاتِ جدیدہ سے مزیّن فرمایا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ افراطِ مضامین اور کثرتِ محاسن پر بھی طبیعت کی کمزوری اور ذہن کی کوتاہی کہیں ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جنابِ علی اکبرؑ اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ خیمہ میں تشریف لے گئے ہیں اور سیّد الشہداؑ اہلبیتؑ سے رخصت طلب ہیں، یہاں پر خاندانِ امامت کے مرد و عورت کا ایک غمناک سین دکھایا ہے۔

اکبر پھوپھی کو دیکھ کے بولے کہ ہے غضب — لو آفت آئی رَن کو چلے شاہِ تشنہ لب

دوڑے سروں کو کھولے ہوئے اہلبیتؑ سب بانو گری تڑپ کے قدم پر بصد تعب
بیٹے نے تھامے ہاتھ شہِ کربلائی کے
زینبؑ نے سر لگا دیا سینے سے بھائی کے

لندن کے نامی آرٹسٹ اِس گروپ کے موشنس کو فنِ تصویر کشی کی قوت سے نہیں دکھا سکتے جو نظارہ میر انیسؔ کے قلم نے پیش کیا ہے۔ اس صورت میں بھی یہ عالم ناتمام رہتا ہے۔ آگے کے ایک بند نے واقعات کا پورا نقشہ دکھایا ہے۔

شانے پہ منھ کو رکھ کے پکارے شہِ زمن اماں کی تم سے بُو مجھے آتی ہے اے بہن
بولی یہ ہاتھ جوڑ کے بانوئے خستہ تن آقا ابھی تو زندہ ہے اکبرؑ ساصف شکن
دُکھ درد میں پدر کے پسر کام آتے ہیں
آپ ان کے ہوتے کس لیئے میداں میں جاتے ہیں

چونکہ ساری انجمن میں اضطراب وانتشار پھیلا ہوا ہے اس لیئے میر انیسؔ کی شاعری بھی اُس انتشاری حالت کی تصویر کھینچتی ہے۔ اب عالمِ تصور میں واقعاتِ اصلی کا مشاہدہ کرنے والے جذباتِ فطرتِ انسانی کے ساتھ ساتھ مقدس خاندانِ امامت کے اخلاص و محبت کو ملاحظہ فرمائیں گے اور خاندانِ امامت کا طرزِ معاشرت بھی ملحوظِ خاطر رہے تو میر انیسؔ کی تخئیل گذر جانے والی صدیوں کا فاصلہ ایک سیکنڈ میں طے کرے گی اور وہ نظارہ سامنے آجائے گا۔ چونکہ فراقِ امام علیہ السلام کے جگر دوز واقعہ سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ اہلبیتؑ سر کھولے ہوئے امامؑ کے گرد ہیں، جنابِ علی اکبرؑ باپ کے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ تھامے ہیں، جنابِ شہر بانو حضرت کے قدموں پر گری ہوئی ہیں، بہن کا سر بھائی کے سینے پر ہے اور بھائی کا مُنھ بہن کے شانے پر ہے یہ شاعری اگر الہامی نہیں تو اور کیا ہے۔ فقط یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ میر انیس زبان ہی پر قادر تھے۔ میں تو علاوہ فصاحتِ زبان اور محاسنِ شاعری کے خیالات پر زیادہ ریویو کر رہا ہوں کیوں کہ زبان تو اُن کی مُسلّم ہے مگر خیالات اُن کے بلند پروازی کے سبب سے عوام کی نظروں سے دُور

ہیں وہ مرثیہ گو شاعر ہیں اور عام طبیعتیں ایسی شاعری کی طرف رجوع نہیں ہوتیں اس لئے لوگوں کو اُن کے مرثیے دیکھنے کا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔ قدر دانانِ سخن مذاقِ تغزل کی جانب زیادہ مائل ہیں، اساتذہ کے دیوان ہر نوجوان کی میز پر موجود ہوں گے مگر میر انیس کا مرثیہ فیصدی دس اہلِ علم کے کتب خانوں میں نہ نکلے گا۔ مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُن شوقینوں کو اس کی خبر نہیں کہ میر انیس کا مرثیہ تمام اصنافِ سخن کے مذاق کا ذخیرہ ہے۔

شہ نے کہا نہیں مجھے اس کا نہیں خیال　　ہے تم کو ہاجرہ کی طرح صبر میں کمال
اپنے چمن کو دیکھ کے ہوتے ہیں سب نہال　　خود چاہتا ہوں میں کہ یہ گل ہو نہ پائمال
شادی کے دن ہیں آس غریب الوطن کی ہے
صدمہ مجھے یہ ہے کہ ریاضت بہن کی ہے

چونکہ سید الشہدا کو بذریعہ علمِ امامت یہ خبر تو تھی ہی کہ مجھ سے پہلے علی اکبر شہید ہوں گے اس لئے جنابِ شہر بانو کے صبر کی تعریف فرما کر ماں کا دل بڑھاتے ہیں اور بہن کا پاسِ پرورش بھی منظور ہے اُن سے بھی کچھ کہوانا چاہتے ہیں، یہ رمز کس شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے؟ بالکل سادے سادے بند ہیں، اگر رو میں پڑھے جائیں تو سوائے معاملہ بندی کے سامعین کو کوئی خاص جدتِ خیال محسوس نہ ہوگی مگر صاحبِ مذاقِ سلیم کے دل سے ان نکات کا لطف پوچھنا چاہیے شاعری کے طومار باندھ کر زمین و آسمان کے قلابے ملا دینا جس قدر آسان ہے اُسی قدر میر انیس کی سادی شاعری کا فلسفہ دشوار ہے۔

بولی وہ عندلیبِ چمن پرورِ بتولؑ　　طرہ وہی ہے سب پہ مہیسر چڑھے جو پھول
لائے نخلِ باغِ فیض و گلِ گلشن رسولؐ　　داغِ گلِ ریاضِ تمنا بدلِ قبول،
شادی سدا نہیں چمنِ روزگار میں
روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں

اس بند کا مذاقِ شاعری کچھ اور ہے۔ جہاں قوتِ بلاغت دکھاتے ہیں وہاں پروازِ ذہن

عالمِ بالا سے بھی بالا بالا ہے۔اس ارادہ میں مرزا غالب کا مذاق پیدا ہو گیا۔ عندلیبِ چمن پرور کی ترکیب نے عجب اندازِ بلیغ ظاہر کیا ہے۔ تیسرے مصرعہ میں چار اضافتیں اور چوتھے میں تین ہیں مگر تواتر و تکاثرِ اضافات سے مصرعوں کے ڈھلاؤ اور سلاست میں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ نہ اغلاق پیدا ہوتا ہے اور داغِ گلِ ریاضِ تمنا پدرِ قبول کی داد تو مرزا غالب کی روح سے لینا چاہیئے۔ یہ دشوار پسندیاں ہیں جن کو سلاستِ زبان کے تیزاب نے پانی کر دیا ہے۔ اس رنگ میں چار مصرعے موزوں کرنے کے بعد بیت کے لئے ایک خاص مضمون تلاش کیا گیا ہے جس سے پیوندِ نظم میں مغائرت نہیں ہونے دی ہے۔

صدقے گلِ ریاضِ نبیؐ پر ہزار لال ‏ کیجیے کنیز کی نہ ریاضت کا کچھ خیال
ان کو بھی صدقے ہونے کی ہے آرزو کمال ‏ بھائی پہ آنچ تو بھتیجے کا کیا خیال
ہاں دل یہ چاہتا ہے کہ دم بھر جُدا نہ ہوں
کام آئیں غیر جب تو یہ کیوں کر فدا نہ ہوں

بند کے بند صنعتِ مراعات النظیر سے بھرے پڑے ہیں مگر روانیِ طبیعت اُن کا عقدہ کھلنے نہیں دیتی۔

بس اب رضا جہاد کی دیں قبلۂ زماں ‏ گر گر قدم پہ شہ کے یہ بولا وہ نوجواں
کانپے جو پاؤں گرنے لگی تھر تھرا کے ماں ‏ صدمہ ہوا پھوپھی کے جگر پر کہ الاماں
خوں گھٹ گیا امامِ زماں زرد ہو گئے
اچھا کہا، مگر ہمہ تن درد ہو گئے

(اچھا) خدا جانے کن کن اہم سوالات کے جواب میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے جس میں دنیا بھر کے موشنس بھرے ہوئے ہیں۔ میر انیس ملکِ عدم سے اس مصرعہ کے پڑھنے کو واپس کئے جائیں تو (اچھا) کے اشارات پر تنقید لکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ مرثیہ میں رخصت کا مقام نہایت دشوار و اہم ہے اور اس موقع پر بڑے بڑے قادر الکلاموں کی قلعی کھل جاتی ہے

مگر یہ قلعہ میر انیس کی شاعری نے فتح کیا اور اپنی نسل کے لیے یادگار چھوڑ گئے۔

سراپا

پھیلی ہوئی ہے دشت میں زلفِ رسا کی بُو
کچھ بُو ہے گیسوؤں کی تو کچھ کربلا کی بُو
گُل تھا یہ بُو ہے سلسلۂ مصطفٰےؐ کی بُو
مٹی ہے اس کے سامنے مُشکِ خطا کی بُو

حلقے نہیں یہ گیسوئے عنبر سرشت کے
دیکھو کُھلے ہوئے ہیں دریچے بہشت کے

پیدا ہے زلف و روئے منور سے شانِ رب
نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب
یہ لطف صبحِ عید و شبِ قدر میں ہے کب
ہے اک طرف تو چین و خطا بیچ میں حلب

رستا نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

کیوں زلف کی ثنا میں اُلجھتے ہیں موشگاف
سلجھا ہوا بیاں ہے تو مضموں ہے صاف صاف
تعقید سر بسر ہے فصاحت کے برخلاف
باریک اس سخن کی ہیں راہیں خطا معاف

فکریں رسا ہیں جن کی یہاں وہ بھی ہیچ ہیں
رستا تو بال بھر کا ہے اور لاکھ پیچ ہیں

اس مذاق پر میں تنقید کی ضرورت نہیں دیکھتا کیوں کہ یہ شاعری کی رنگینیاں ہیں اور تشبیہ و استعارات میں جدت پسند طبیعت کی بلند پروازی کا عمدہ اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس رنگ سے ہر شخص کو دلچسپی ہے۔

تعریفِ ابرُو

ابرو ہیں دو ہلال تو پیشانی آفتاب
ہے آسمانِ عز و شرف یہ فلک جناب
ہاں دیکھ لیں رُخِ خلفِ ابنِ بُوتراب
منظور شمسی و قمری کا ہے گر حساب
باریک ہیں سمجھ گئے مطلب انیس کا
اُنتیس کا یہ چاند ہے وہ چاند تیس کا

میر انیس کو عامیانہ مضامین سے کس قدر نفرت ہے جس موقع کو عرب و عجم اور ہند کے مشاہیر شعرا نے قصیدوں اور غزلوں میں پامال کیا ہے اس میں بھی اُن کی طبیعت توارد سے نفرت کرتی ہے۔

دُور ہے جو سُرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
جاگے ہیں رات کے تو نقاہت ہے آشکار
آنسو ہیں یا صدف میں ہیں دُرہائے آبدار
مستانہ ہے یہ طَور کہ جھکتے ہیں بار بار
روئے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

سلسلۂ تنقید میں یہ چند بند لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ وہ لوگ دیکھیں جنہیں رنگِ تغزل سے زیادہ دلچسپی ہے میر انیس کی طبیعت کسی رنگ میں قاصر و عاجز نہیں ہے جو مرثیہ میں ایسے گوشے پیدا کر سکتا ہو اُس کو غزل کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

کیفیتِ میدانِ جنگ

تھے آگے پیچھے دست بریدہ لبانِ موج
تھا نہرِ علقمہ کے قریں بحرِ خوں کا اوج

طوفانِ آبِ تیغ میں ڈوبی ہوئی تھی فوج
سر صورتِ حباب نمایاں تھے فرد فرد
بھاگیں تو گھاٹ تیغ کا مابینِ راہ تھا
خشکی میں فوجِ شام کا بیڑا تباہ تھا

ایسے قوت دار استعارے دیکھنے میں نہیں آتے لوازم و مناسباتِ استعارہ میں کسی چیز کو نہیں چھوڑتے، مصرعہ اول سے چھٹے مصرع تک کوئی مصرع تلوار یا دریا سے خالی نہیں مگر فصاحتِ زبان کی بے تکلفی کے سامنے ہر مشکل آسان معلوم ہوتی ہے۔

تلوار کی تعریف

نکلی ادھر سپر سے کہ آ پہنچی سر کے پاس
پھول اڑ گئے وہ پھل اس کا جو پہنچا سپر کے پاس
دل سے جگر کے پاس جگر سے کمر کے پاس
سر سے اتر گئی دلِ بیداد گر کے پاس
کھولا کمر کا بند تو در آئی زین میں
زیں سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں

حیرت تو یہ ہے کہ ان باتوں کو سیکڑوں مرثیوں میں نظم فرمایا ہے مگر جدتِ خیال کا لطف ہر جگہ نیا ہے۔

آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب
تیزی زباں میں وہ کہ فرشتہ کو دے جواب
سیلی تھی اک پری کے تشکم پر کہ اس کی تاب
جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

تیسرے مصرع میں تشبیہ کی جدت اور چھٹے مصرع کی صنعت قابلِ غور ہے۔

غل تھا کہ ایک گھاٹ پہ پانی بھی نار بھی
پیاسی بھی خونِ فوج کی اور آب دار بھی

بجلی بھی ابرِ تر بھی خزاں بھی، بہار بھی   تلوار بھی، سپر بھی، چھُری بھی، کٹار بھی

پانی نے اُس کے آگ لگا دی زمانے میں
اِک آفتِ جہان تھی لگانے بجھانے میں

طبیعت کی یہ کیفیت ہے کہ بحرِ زخار موجیں مار رہا ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو محاسن بادی النظر میں محسوس نہیں ہوتے وہ مانندِ عناصر، الفاظ میں مخلوط ہیں یہ شاعری کی علّتِ غائی ہے۔

"پیاسی بھی خونِ فوج کی اور آبدار بھی"۔ باوجود تشنۂ خوں ہونے کے آب داری تلوار کی تعریف ذاتی ہے۔ مصرعِ ثانی کے مضمون کو مرثیۂ اوّل کی تنقید میں بھی میں نے لیا ہے ؎

پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان

مگر یہاں باوجود مطابقتِ مضمون جدّتِ خیال ظاہر ہے یعنی گھاٹ کے لفظ نے اُس کے مناسبات کے ساتھ فرق پیدا کر دیا ہے۔ بجلی بھی یعنی چمک وجہِ شبہہ، ابرِ تر بارشِ خون، خزاں مقتولوں کی جان کی بربادی، بہار۔ گل ہائے زخم کی تازگی یا جوہروں کی گلکاری۔ بیت کی خوبی اس پر طرّہ ہے۔ زخمیوں پر غلبۂ تشنگی۔ اس کیفیت سے زمانہ میں آگ لگا دینا لگانا بجھانا اُردو کی اصطلاح ہے اور اصطلاحی صورت میں ایک معمولی بات ہے مگر کثرتِ زخم سے آگ لگانا اور پھر آبِ دمِ شمشیر سے بجھانا صنعتِ ایہام اور حسنِ معنوی پیدا کرتا ہے۔

اِس ہنگامۂ جدال و قتال میں ایک تازہ وارد پہلوان فوجِ شام کی ہزیمت دیکھ کر افسرانِ لشکر سے مجاہد کا نام دریافت کرتا ہے۔

بولا شقی کہ فوج کا لڑکے سے ہے یہ حال   ٹوٹے ہیں مورچے صفِ لشکر ہے پائمال
تب شمر نے کہا کہ یہ ہے شیرِ حق کا لال   طفل و جوان و پیر ہیں اس گھر کے بے مثال

سر ہر ہو کون قہرِ خدا ہے وغا نہیں
اُس پر کہ تین روز سے پانی پیا نہیں

ناری کے آگ لگ گئی سُن کر علیؑ کا نام
بولا بگڑ کے وہ کہ مرے منھ پہ یہ کلام
پھر کیا اگر علیؑ کا خلف ہے یہ تشنہ کام
کرتی ہے شق پہاڑ کا سینہ مری حسام
پیدا کیا ہے نام ہزاروں کو مار کے
اُتروں گا اب فرس سے سر اس کا اُتار کے

یہ دونوں بند واقعات کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے میں نے لکھے ہیں مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میر انیس واقعات اصلی کی سادی تصویر میں بھی فصاحت زبان کا رنگ بھر دیتے ہیں

تفاخرِ شاعرانہ

ہاں اے محیطِ طبع روانی دکھا مجھے
پیری میں زور و شورِ جوانی دکھا مجھے
ہاں اے زبانِ سیف زبانی دکھا مجھے
اے نطق آج سحر بیانی دکھا مجھے
تلوار کھنچ گئی دمِ تیغ آزمائی ہے
آفت کا معرکہ ہے غضب کی لڑائی ہے

یہ بھی میر انیس کا التزام خاص ہے کہ درمیانِ مرثیہ میں حسب موقع ایک مطلع کا پیوند ایسا لگاتے ہیں جس سے سامعین کے خیال میں ایک تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور طبیعتیں حسن سماعت کی جانب از سرِ نو آمادہ ہو جاتی ہیں جس طرح کوئی خوبصورت انسان حدِ جوانی پر پہنچ کر دلفریب ہو جاتا ہے اسی طرح مرثیہ کا شباب شروع ہوتا ہے

بڑھتا ہے مثلِ تیغ ادھر سے یہ نامور
دب دب کے پیچھے ہٹتا ہے وہ صورتِ سپر
یوں نعرہ زن ہے غیظ میں شبیرؑ کا پسر
یہ اضطراب جنگ میں ظالم ٹھہر ٹھہر
حملے تو دیکھ رُخ سے جھلم کو اُتار کر
او رُو سیاہ آنکھ تو شیروں سے چار کر

پہلے اور دوسرے مصرع کی تشبیہہ بالکل نئی ہے۔ چوتھے مصرع سے جناب علی اکبرؑ کا اطمینان اور مخالف کا اضطراب دکھایا ہے۔ چھٹے مصرع میں یہ خیال ہوتا تھا کہ رو سیاہ کا خطاب محض بغرضِ موزونیِ مصرع نوازش کیا گیا ہے ورنہ مقتضائے مقام تھا کہ بزدل یا نامرد وغیرہ، اس قسم کے خطاب نظم فرماتے، مگر غور و فکر سے ثابت ہوا کہ پانچویں مصرع سے اُس کی خوبی متعلق ہے۔ رُخ پر جھلم پڑے ہونے کی وجہ سے رُو سیاہ کا لفظ تصرف با محل ہے کہ دوسرا لفظ رکھنے کی کسی شاعر میں قدرت نہیں، ایک ایک بند کے محاسن پر نظر ڈالی جائے تو ایک ہی مرثیہ میں نقاد اپنا زمانۂ حیات صرف کر سکتا ہے مگر میں اس طول سے قطع نظر کر کے ایک خاص نازک خیالی کی جانب ناظرین کی توجہ مائل کروں گا۔ مرثیہ کے واقعات، پابندِ حدیث ہیں مگر حسبِ ضرورت مضامین شاعرانہ کے ساتھ ساتھ میر انیس اندازِ مرثیت کا کافی لحاظ رکھتے ہیں چنانچہ یہاں فاضل شاعر کو ایک گوشہ مل گیا ہے جس میں خاندانِ امامت کی مروّت و شجاعت کا نقشہ کھینچا ہے۔

بولا سپر کو فرق پہ رکھ کر وہ پُر غرور
میداں گرہ ہے نار کا، اے کبریا کے نور
پُھنکتا ہے دل یہ دھوپ ہے پیاس کا وفور
بھڑکی ہے آگ سینے میں اک صورتِ تنور
ہر چند ہاتھ دھوئے ہوں اپنی حیات سے
مہلت ملے تو پی لوں میں پانی فرات سے

خاندانِ امامت کی رحمدلی

تلوار روک کر یہ پکارا وہ نیک نام
تُو نے سنا تو ہوگا کہ ہم بھی ہیں تشنہ کام
تلوار روکنے کا نہ تھا گرچہ یہ مقام
پر خیر پی لے نہر سے پانی کا بھر کے جام
فیّاض ہیں کریم ہیں، ابنِ کریم ہیں

دشمن پہ رحم کرتے ہیں ہم وہ رحیم ہیں

دوسرے مصرع کی تخیل پر کیا تنقید کی جائے کیوں کہ سوائے سلاست بیان اور فصاحت زبان صنائع و بدائع شاعری کو بالکل دخل نہیں ہے مگر ایسا خداداد اثر بھرا ہوا ہے کہ دل بے چین کر رہا ہے اور اپنے اندازِ شاعری کے موافق اس مصرع میں ایک تلمیح صرف کر گئے ہیں ؎

تُونے سُنا تو ہوگا کہ ہم بھی ہیں تشنہ کام

اگر یوں فرماتے کہ تُو جانتا ہے یا تجھے معلوم ہے کہ ہم بھی پیاسے ہیں تو میر انیس کی شاعری کی ترجیت پیدا نہ ہوتی۔ اس جملے نے مرثیہ کی شان دکھا دی اور مصرع پورا مرثیۂ غم انگیز بن گیا آلِ رسولؐ پر پانی کا بند ہونا ایک ایسا مشہور واقعہ تھا کہ جو پہلوان منازلِ راہ طے کر کے ابھی ابھی داخلِ لشکرِ ابنِ سعد ہوا ہے اس نے بھی یہ خبر کہیں نہ کہیں ضرور سُن لی ہوگی۔ پس جنابِ علی اکبرؑ کا مقصود میر انیس کی شاعری نے ترجمہ کیا ہے۔

پانی پہ گر پڑا وہ کہ تھی صبر کی نہ تاب	لے آیا آب سامنے خادم بصد شتاب
پیاسے تھے تین دن کے رہی تلب کو نہ تاب	ظالم نے سامنے جو پیا ڈگڈگا کے آب

تڑپا جو دل تو چشم کے ساغر چھلک پڑے
اُٹھا دھواں جگر سے کہ آنسو ٹپک پڑے

اس بند میں ایک تصویر کھینچی ہے کہ دشمن کا سامنے پانی پینا اور جنابِ علی اکبرؑ کا فرطِ تشنگی سے بے چین ہو جانا یہ انسانی طبیعتوں کے قدرتی جذبات دکھائے گئے ہیں اور ڈگڈگا کے آب یہ ایک ایسا مشہور محاورہ ہے کہ جس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے مگر ایسے بہت سے خیال ہیں جو قدرت کی جانب سے شعرا کے لئے وقف تھے اور اب میر انیس کی ملکیت ہو گئے جس پر کوئی قبضہ نہیں کر سکتا۔

کی عرض کیجے آپ بھی پانی سے حلق تر	سیراب ہو چکا جو وہ سفاک و بدگہر
آبِ حیات ہو تو پئیں ہم نہ بے پدر	فرمایا تشنہ لب ہیں شہنشاہِ بحر و بر

ڈوبے ہوئے ہیں چشمۂ کوثر کی چاہ میں
یہ آب زہر ناک ہے اپنی نگاہ میں

مناسبات شاعری اور صنعت مراعات النظیر کے علاوہ خاندان امامت کی غیرت وصبر کے جوہر دکھائے ہیں، ہر چند بند اول کے چوتھے مصرع کا اضطراب اس بات کا مقتضی تھا کہ جناب علی اکبرؑ بھی پانی پی لیتے مگر اب وہ بات بھول جانا چاہیئے کہ پیاس کی بے چینی نے شہزادۂ علی اکبرؑ کو رُلا دیا تھا کیوں کہ فرزند امامؑ کو پیاس کی تکلیف نہیں رُلا سکتی مگر میر انیس اس بند میں یہ نازک خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اپنی تشنگی کی بے چینی سے محبت دار فرزند کو مظلوم باپ کا خیال آگیا تھا اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی پیاس کے تصور نے فرزند امامؑ کے استقلال کو تھوڑی دیر کے لئے جنبش دے دی تھی۔ اب وہ وقت ہے کہ جناب علی اکبرؑ گھوڑے سے گر کر استغاثہ فرماتے ہیں اور سید الشہداؑ لاش فرزند کی تلاش میں مصروف ہیں۔

ناگہ صدا یہ آئی کہ بابا ادھر ہوں میں　　اے نخل باغ فاطمہؑ زیر شجر ہوں میں
خالق سے لو لگی ہے چراغ سحر ہوں میں　　جلد آئیے کہ آپ کا پیارا پسر ہوں میں
دردِ جگر کہیں نہ اجل کا بہانہ ہو
دیدار دیکھ لے تو مسافر روانہ ہو

الفاظ استغاثہ میں جو درد بھرا ہے وہ میر انیس کے خون جگر کی جھلکیاں دکھا رہا ہے۔ چھٹے مصرع کے ایک ایک لفظ کو غور سے دیکھ کر چاہا کہ کچھ لکھوں مگر اس مقولہ کیفی کا اظہار میرے قلم کے ذریعہ سے مشکل ٹھہرا اور (خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست) پر عمل کرنا پڑا۔

بس اب مرثیہ کے دو بند جناب زینبؑ کے بین کے متعلق اور لکھوں گا۔ اہلبیتؑ امامت کی زبان لکھنے کے لیے میر انیس کے دہن میں زبان پیدا ہوئی تھی، مصرعوں کے اثرات پر اگر نظر ڈالی جائے تو قلب نقاد میں حرکت مذبوحی پیدا ہو جاتی ہے۔

اے پیچ دار گیسوؤں والے ترے نثار　　اے یادگار گیسوؤں والے ترے نثار

اے مشکبار گیسوؤں والے ترے نثار ۔۔۔ اے میرے چار گیسوؤں والے ترے نثار

دُنیا سیاہ ہو گئی رستہ پہاڑ ہے

جنگل بسا ہوا ہے مرا گھر اُجاڑ ہے

صرف ایک لفظ قافیہ اور سارا مصرع ردیف اور پھر اُس میں حرفِ ندا کی قید لگی ہوئی۔ یہ اعجازی شاعری ہے اور یہ الہامی تخئیل ہے۔

اے میرے گلبدن مرے ابرو کماں جواں ۔۔۔ اے میرے کم سخن مرے شیریں زباں جواں

اے میرے صف شکن مرے حیدر نشاں جواں ۔۔۔ اے میرے تیغ زن مرے شیرِ ژیاں جواں

لاکھوں سے معرکہ تپشِ آفتاب میں

دو دن کی پیاس نے تجھے مارا شباب میں

کون کہہ سکتا ہے کہ اس بند میں صنعتِ تقابل و صنعت ذو قافیتین موجود ہے۔ ڈھلے ہوئے مصرعے بے تکلف اندازِ نظم کسی طرح صنائع و بدائع کا امتیاز نہیں ہونے دیتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صنائع کی اہمیت میں میر انیس کو کچھ کاوش نہیں ہوتی تھی۔ یہ مصرعے نقشِ قرآنی کی طرح مرتب آسمانی فرشتے لے آتے تھے۔ سبحان اللہ۔ جنابِ زینبؑ اپنی گود کے پالے لاڈلے بھتیجے کی لاش پر جو بین کرتی ہیں اس کے چھٹے مصرع میں میر انیس نے ایک نازک خیالی ظاہر کی ہے یعنی خاندانِ امامت کے بچے دشمن سے مغلوب ہونے کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔ بیٹا تم ایسے جوان مرد تھے کہ دُنیا کا کوئی قوی سے قوی دشمن فتح یاب نہ ہو سکتا تھا مگر افسوس تمہاری موت کا سبب تمہاری دو دن کی پیاس ہے۔

تیسرے مرثیہ کا انتخاب

اس مرثیہ میں میر انیس نے واقعاتِ اصلی کا نقشہ کھینچا ہے۔ عزیز و انصارِ امام شرفِ شہادت

حاصل کرنے کی امید میں مسرور ہیں۔ ابوالفضل عباسؑ کو فوجِ حسینیؑ کا علم ملا ہے۔ مجاہدین انتظامِ جنگ و سامانِ جہاد میں مصروف ہیں، اُس وقت میر انیس کا قلم ایک نظارہ دکھاتا ہے۔

سب خوش تھے خیمۂ ذی جاہ میں مگر ۔۔۔ چیں بر جبیں تھے زینبؑ ناشاد کے پسر
نہ جانبِ علم تھی نہ ماں کی طرف نظر ۔۔۔ آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر

اس طرح تھا عرق رُخِ پُر آب و تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

واقعاتِ تاریخی سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب زینبؑ کے صاحبزادوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ مستحقِ علمداری ہم ہیں چوں کہ علم نہ ملنے سے صاحبزادوں کو ایک کاہش تھی۔ لہٰذا یہ موشگاف فاضل شاعر نے بلحاظِ مقتضائے وقت و تقاضائے کمسنی، الفاظ کے ذریعے سے دکھائے ہیں مگر تیسرے مصرع سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود استحقاق اس خواہش کو ترکِ ادب اور خلافِ مصلحتِ امامؑ سمجھے ہوئے تھے اس لئے علم کی جانب اور اپنی والدۂ مقدسہ کی جانب نہیں دیکھتے تھے کہ اس انداز سے دلی خیالات کا اظہار نہ ہو۔ میر انیس کی تصنیفات میں سب سے زیادہ اِس حال کے مرثیہ ہیں۔ ایک ہی واقعہ اور ایک ہی حالت کو میر انیس نے ہر مرثیہ میں جدّتِ مضامین کے ساتھ نظم فرمایا ہے اور یہ ایک واقعہ نگار شاعر کے لئے بہت مشکل راستہ ہے۔

پھر کر اُدھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر ۔۔۔ سمجھیں علم نہ ملنے سے بیدل ہے یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر ۔۔۔ آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر

بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اُداس ہیں

اس مقام پر فاضل شاعر نے صناعاتِ شاعری کی رنگینیاں نہیں صرف کی ہیں بلکہ معاملات کو اپنی مقبول زبان میں نظم کرکے واقعات کی رازداری دکھائی ہے اور ماں بیٹوں کی گفتگو

میں حفظِ مراتب اور ادب آموزی کا خاتمہ کر دیا ہے پس مجھے اس تخئیل کا دکھانا منظور ہے۔ میر انیس کی یہی شاعری قابلِ تحسین و لائقِ قدر ہے جس پر سوائے خواص کے عوام کو کافی نظر ڈالنے کا موقع نہیں ملا بلکہ ہندوستان اس مذاق سے بے خبر رہا ہے۔ نظم کی ظاہری نمائش اور شوکتِ الفاظ پر مرنے والے شاعری کی علتِ غائی سے ناواقف تھے مگر مغربی تعلیم کی ترقی نے مذاقِ شاعری کے قابلِ قدر رازوں کو رفتہ رفتہ آشکارا کر دیا۔ ماں نے بیٹوں پر نظر ڈالتے ہی اُن کے ارادے سمجھ لئے اور فوراً یہ خیال گذرا کہ بچّوں کی افسردگی مزاج اور بیرمی طبیعت سے یہ راز اوروں پر نہ ظاہر ہو جائے اس لئے لوگوں کی نظریں بچا کر اشارہ سے علیحدہ بُلا کر سمجھاتی ہیں:۔

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہِ حق شناس	تم نے زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
مَردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس	دولہا سے بن کے جاؤ امامِ زماں کے پاس

کچھ مُلجے ہیں آؤ میں کپڑے اُتار دُوں
سُرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دُوں

بچّوں کے خیالات دوسری جانب مائل کرنے کے لئے تیسرے مصرعے میں ہمتِ مردانہ کی طرف غیرت دلاتی ہیں۔

ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم و جور	نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور
اب مشورے ہیں اور ارادے ہیں اُور اُور	پیارو ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور

وہ دل نہیں وہ آنکھ نہیں وہ نظر نہیں
اوروں کا ذکر کیا تمہیں میری خبر نہیں

کسی شاعر کے کلام میں یہ قوت مشکل سے تلاش کی جاسکتی ہے جو ہر ارادے کی تشریح میں صفائیِ نظم سے دلفریبی پیدا کرے۔ ماں نے بیٹوں کے قصد سے واقف ہو کر افہام و تفہیم کا ایک نازک پہلو اختیار کیا ہے مگر مُدعائے خاص کی جانب صاف صاف لفظوں میں اب تک

کوئی اشارہ نہیں کیا۔ شاعر نے پہلے سے بچوں کی طبیعت پر اطاعت و ادب کا بار ڈالا ہے
جس سے وہ خود اپنی زبان سے اعترافِ قصور کرلیں۔

ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں — اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جئے گی ماں
مجھ سے سوا ہے کون تمہارا مزاج داں — تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں

جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصّے کی انکھڑیاں ہیں کہ پہچانتی ہوں میں

اس تقریر سے بتدریج صاحبزادوں کا غصّہ فرو کیا جاتا ہے۔ شاعری کے تیوروں سے پچھلے مصرع
کے استفہامِ اقراری نے اردو ادب کی عظمت دکھائی ہے۔

دونوں نے عرض کی کہ ہمیں کچھ نہیں ملال — پردہ ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال
اوروں کی پرورش ہے ہمارا نہیں خیال — ہاں ہم کو آج بھول گئے شاہِ خوش خصال

کیا وارثِ دارِ جعفرِ طیار ہم نہ تھے
اس عہدۂ جلیل کے حق دار ہم نہ تھے

اگر جناب زینبؑ کی جانب سے اس قسم کا دفع دخل نہ کیا جاتا تو بچوں کی جانب سے بہت
خوفناک الفاظ میں اظہارِ ملال کا خیال تھا اور کمسِنی کی ضد کے طوفان کا فرو کرنا غیر ممکن تھا مگر
میر انیس کی شاعری کا پیچ و خم اور آتار چڑھاؤ ان غیر معمولی مشکلوں کو آسان کر کے دکھاتا ہے۔
میر انیس کی شاعری میں یہ پیچیدگیاں نازک خیالیوں کے ساتھ باعثِ رفعتِ فنِ شاعری ہیں اور
اسی بنیاد پر آتش کا قول فیصل قابلِ تسلیم ہے (تم شاعر نہیں شاعر گر ہو)
"انگشت رکھ کے دانت میں ماں نے کہا کہ ہا!" یہ مورشنس اگر کوئی شاعر لفظوں میں دکھا دے
اور اس شکل سے تنبیہہ و تادیب و تفہیم کی تصویر کھینچ دے تو ہم اس کو آج میر انیس کہنے کے
لئے تیار ہیں اور اگر ان کے بعد کسی شاعر نے یہ قوت نہ دکھائی تو معلوم ہوا کہ زمانہ ہزاروں
پلٹے کھائے مگر میر انیس پیدا نہ ہوں گے۔

آپ اُس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا۔ بالفرض اگر تم مستحقِ علمداریٔ فوجِ امامؑ تھے اور حسبِ مصلحتِ امامؑ یہ منصب حضرت عباسؑ کو مل چکا تھا تو اب کسی قسم کا ملال ترکِ ادب ہے کیوں کہ اتباعِ مصلحتِ امامؑ ضرور ہے اور مقتضائے سعادت مندی بچوں کے سمجھانے کا نرالا ڈھنگ دکھایا ہے اور ہر ایک پہلو سے قابلِ اطمینان نصیحت کی گئی ہے۔

دیکھو سُنیں نہ زوجۂ عباسِؑ باوفا اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلہ کی جا

غبطہ نہ اُس میں چاہیئے جو امرِ خیر ہو

داری وہ کون غیر ہے تم کون غیر ہو

یہ بھی خوف دلاتی ہیں کہ بزرگوں کو رنجیدہ کرنا خلافِ شانِ سعادت مندی ہے۔ میر انیسؔ کی مشکلوں کا کچھ ٹھکانا نہیں بنظرِ غور و انصاف دیکھنا چاہیئے کہ اس حال کے کتنے مرثیے لکھے ہیں اور وہ واقعات جو پابندِ حدیث ہیں اُن کے نظم فرمانے میں کہاں کہاں جدت کی ہے اور کون کون سے گوشے نکالے ہیں۔ میر انیسؔ اپنے اظہارِ خیالات کے لئے افراطِ الفاظ و کثرتِ جذبات کا خزانہ اپنے پاس رکھتے ہیں اور اُن کی طبیعت نازک خیالیوں کے تصرّت میں سمندر کی طرح جوش مارتی ہے۔ فصحائے اُردو ان معنوں کو نثر میں اس وضاحت و فصاحت سے نہیں لکھ سکتے۔ بہرکیف اتنا کچھ سمجھانے کے بعد جنابِ زینبؑ نے ایک آخری خیال اور ظاہر کیا ہے جس سے سوائے خاموشیٔ فرزندانِ رشید کوکوئی چارہ نہیں اور وہ یہ ہے۔

اک دوپہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال

تا عصر تم نہ ہو گے نہ عباسِ خوشخصال

اشارہ فرماتی ہیں کہ جب دوپہر میں تمام خاندانِ امامت کا خاتمہ ہو جائے گا تو اتنے عرصہ کے لئے اس منصب کی ہوس بے کار ہے۔ چونکہ صاحبِ معاملہ جنابِ عونؑ و محمدؑ اور جنابِ عباسؑ ہیں اس لئے مصرعِ ثانی میں فاضل شاعر نے جنابِ زینبؑ کی زبان سے اس نازک راز کو ظاہر کیا ہے۔ نزاکتِ مضمون کے علاوہ اندازِ مرثیت کو قوت دی ہے۔ بس اسی آخری خیال کے

بعد صاحبزادوں میں سرفروشی اور جاں نثاری کا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

"اُس دن کی دے گئے ہیں خبر شاہِ ذوالجلال"۔ یعنی میں تمہارے بہلانے کو نہیں کہتی بلکہ شہادتِ معتبر پیش کرتی ہوں۔

مجھ کو یقین نہیں کہ بچے "فاطمہؑ کا لال"۔ منصبِ علمداری تمہیں ملے یا جنابِ عباسؑ کو مگر امامِ حسینؑ کا بچنا غیر ممکن ہے۔

پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے
رہ جاؤں گی میں قبر میں جانے کے واسطے

جب تم میں سے کوئی بھی نہ ہوگا تو اس قضیہ کو بڑھا کر اپنی خاندانی سعادت مندی کو کیوں نقصان پہنچاتے ہو۔ بتدریج خیالات کی قوت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اب وہ قدرتی دباؤ ڈالا گیا ہے جس سے منصبِ علمداری کے طلب گار بچوں کو سوائے باز دعوے داخل کرنے کے کوئی چارہ نہیں۔

لو اپنے دودھ کی تمہیں دیتی ہوں میں قسم — اب کچھ کہو گے منہ سے تو ہوگا مجھے الم
سُنتے تھے تم جو کہتے تھے عباسؑ ذی حشم — دو جا کے اُن کو تہنیتِ عہدۂ علم
صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

کُنبے میں ایک نے بھی اگر سُن لیا یہ حال — کہتی ہوں صاف میں، مجھے ہوگا بہت ملال
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال — ہم باوفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
دیجے سزا ہمیں جو بل ابرو پہ پھیر پڑیں
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں

مجھ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ خاندانِ امامتؑ کے مرد و عورت، بڑے بچوں کی زبان لکھنے کے لئے میر انیسؔ ایک قدرتی شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ واقعات کو کوئی شاعر اس بے تکلفی سے مسلسل

نہیں لکھ سکتا جس طرح میر انیس معمولی روز مرہ میں شوکت و عظمتِ شاعری دکھاتے ہیں۔
اس کے بعد جناب زینبؑ صاحبزادوں کی رخصت کے بارے میں امام علیہ السلام سے سفارش کرتی ہیں۔

نو دس برس کے ہیں ابھی بچوں کا کیا ہے سن
راتیں یہ غفلتوں کی ہیں یہ کھیلنے کے دن

دونوں مصرعے کمسنی کا پورا کیرکٹر ہیں اور فلسفۂ قدرت کے اجزائے پریشان کا مجموعہ، پُر تاثیر تمہید کے بعد رضائے جہاد کے لئے حسنِ طلب اس بند کے چار مصرعوں سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ تو وہ معرکہ ہے کہ ہیں مضطرب حسن لیکن کنیز ان کی طرف سے ہے مطمئن
گھوڑے اڑا اڑا کے جو فوجوں پہ جائیں گے
اتنا میں جانتی ہوں کہ پھر کر نہ آئیں گے

خاندانی جرأت کے ساتھ ساتھ کمسنی کا خطرہ اس دعوے پر وثوق پیدا ہونے نہیں دیتا کہ کوئی کارِ نمایاں کریں گے مگر اتنا اطمینان ظاہر کیا گیا ہے کہ میدانِ جنگ سے منہ نہ پھیریں گے اور اپنی جانوں کو قربان کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ چھٹے مصرع سے جاں نثاری کا کامل بھروسہ انتہائے جرأت و شجاعت کی دلیل ہے مگر میر انیس کی شاعری نے اس خیال کو کچھ ایسے پیرایہ میں پیش کیا ہے جس سے وہ کبر و ناز پیدا نہیں ہوتا جو ایک ماں کو اپنے بچوں کی قربانی چڑھانے پر پیدا ہونا چاہیے تھا۔ یہ باتیں میر انیس ہی جانتے تھے۔

فرمایا شہؑ نے ان کی شجاعت کا ذکر کیا ہیں ورثہ دارِ شیرِ الٰہی یہ با وفا
اچھا ہمارے ساتھ چلے ایک مہ لقا زینبؑ تمہارے پاس رہے ایک دل رُبا
تم کس طرح جیو گی جو دونوں سے یاس ہو
گھر چلتے وقت ایک تو فرزند پاس ہو

ماں کی تسکین کے لئے یہ تدبیر کافی تھی مگر جناب زینبؑ کو بھائی کے مقابل میں فرزندوں

کی جانیں عزیز نہیں اور نہ یہ منظور ہے کہ کسی فرزند کو بھی شرفِ شہادت یا نصرتِ امامؑ سے محروم رکھیں اس لئے فاضل شاعر نے عذر کا ایک نازک پہلو اختیار کیا ہے۔

زینبؑ نے عرض کی کہ مجھے ہے یہ آرزو ۔۔۔ دونوں نثار آپ پہ ہوں میرے روبرو
بچ جائے جان آپ کی یا شاہِ نیک خو ۔۔۔ ہیں طالبِ ثواب یہ خواہانِ آبرو
بہتر ہے دونوں بیٹوں کی گر سوگوار ہوں۔
میں بھی جنابِ فاطمہؑ کی درشتہ دار ہوں

طفلی سے آج تک یہ ہوئے ہیں کبھی جدا؟ ۔۔۔ بچپن سے ایک گھر میں پلے بھی تو ایک جا
چرچا ہے سارے کنبے میں دونوں کے پیار کا ۔۔۔ بے شک ہیں ایک جان دو قالب یہ مہ لقا
تڑپے ملاپ کر جو خفا ہوکے بھائی سے
وہ کس طرح جئے گا جدا ہوکے بھائی سے

چھوٹا تنک مزاج ہے یا شاہِ بحر و بر ۔۔۔ سُن لے تو جان دے دے گلا اپنا کاٹ کر

کچھ عجیب تخیل میر انیسؔ کی ہے جس سے نئی نئی صورت کے معنے پیدا ہوتے ہیں اور سادے لفظوں میں مضامینِ عالی کے دریا اُمنڈتے نظر آتے ہیں۔ شاید امام علیہ السلام کا مقصود یہ ہوگا کہ چھوٹا مستوجبِ رضائے جہاد نہیں اور چھوٹے بچوں سے ماں باپ کو زیادہ اُلفت ہوتی ہے۔ چھوٹے کا بچ جانا ماں کی تسکین کے لئے مناسب و بہتر ہے اس لئے جنابِ زینبؑ نے اس گفتگو کی تہ کو پہنچ کر بڑے بیٹے سے زیادہ چھوٹے فرزند کی تنک مزاجی کا ذکر کر دیا اور پھر دوسرے مصرع سے اپنے ارادہ کا استحکام فرماتی ہیں۔

نو دس برس جہاں میں ہوئے جس طرح بسر ۔۔۔ باہم یونہیں جہاں سے کریں آخری سفر
ہر جا بڑے کے ہاتھ میں چھوٹے کا ہاتھ ہو
میں چاہتی ہوں دونوں کا مرنا بھی ساتھ ہو

دنیا میں کسی ماں نے یہ جگر نہیں پایا کہ اپنے بچوں کی موت سے مسرور و مطمئن ہو اور کسی شاعر

نے ایسی زبان پائی کہ اہلبیتِ اطہار کے پاکیزہ خیالات و جذبات کو اس فصاحت و بلاغت سے نظم کر سکے۔ پیاری بہن کی خاطر شکنی کے خیال نے امام علیہ السلام کو مجبور کر دیا کہ وہ گلزارِ امامت کے غنچوں کو کھلنے سے پیشتر خاک میں ملا ہوا دیکھیں۔

گردن جھکا کے کہنے لگے شاہِ خاص و عام　　تم کو جہاں میں پھر نہ ملیں گے یہ لالہ فام

مٹتی ہے نسلِ جعفرِ طیارِ نیک نام　　چھاتی سے سر لگا کے وہ بولی کہ یا امام

للہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجئے

ہدیہ فقیر کا ہے اِسے رَد نہ کیجئے

میر انیسؔ کی شاعری نے کیا کیا نظارے دکھائے ہیں۔ ذرا غور کیجئے بھائی کو فرطِ محبت سے بچوں کا مرنا گوارا نہیں اور بہن بھائی کی چھاتی سے سر لگائے ہوئے امیدوارِ رضائے جہاد و اجازتِ مرگ ہے اور کن الفاظ میں درخواست کی جا رہی ہے جس کا رد کرنا بہن کے لئے بچوں کی موت سے زیادہ مہلک و جانگسل ہے۔ غرضِ مدعا کے لئے حُسنِ طلب کے ایسے الفاظ جو با محل صرف ہوئے ہیں فصیحانِ زبان کو میسر نہیں ہو سکتے اور پھر میر انیسؔ کی تخیل تک رسائی تو غیر ممکن بلکہ محال ہے۔ اِس فیصلۂ رخصت کے بعد جناب زینب اپنے چھوٹے بھائی جنابِ عباسؑ سے اپنے فرزندوں کی بابت استمداد فرماتی ہیں اور سفارش کرتی ہیں

لے کر بلائیں بھائی کی بولی وہ سوگوار　　اپنے غلام سمجھو انہیں تم پہ میں نثار

پہلے پہل نکلتے ہیں گھر سے یہ گلعذار　　ان کی مدد ضرور ہے ہنگامِ کارزار

صدمہ سے جان اب نہیں زہراؑ کی جائی میں

دھڑکا ہے یہ کہ دیکھئے کیا ہو لڑائی میں

لاکھوں جوان اُدھر انہیں سولہویں کی پیاس　　کیا ہو جو بھیڑ دیکھ کے ہو جائیں بدحواس

کشتی پہ جب ہو شیر تو بے جا ہے پھر ہراس　　دُور ان سے تم نہ رہنا اگر ہے بہن کا پاس

بچے کہاں یہ اور وہ دَلِ فوجِ شام کا

بھیّا مجھے ہے دھیان بزرگوں کے نام کا

خدا جانے خاندانِ امامت کے خیالات لکھنے کے لیے میر انیسؔ کو الفاظ کہاں سے ملتے تھے جو ہر صورتِ معاملہ میں رازداری کا پہلو موجود ہے۔ یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ باعتبارِ شانِ بزرگی و علمداری یہ ایک فرض تھا کہ بچے جنابِ عباسؑ کی سپردگی میں دیے جائیں مگر کسی جگہ یہ نہیں ثابت ہوتا کہ جنابِ زینبؑ نے یہ درخواست کی ہو کہ حالتِ جنگ میں بچوں کے شریک ہو کر مدد کرنا، فقط یہ خیال ہے کہ تقاضائے عالمِ طفلی سے اگر یہ گھبرا جائیں تو اِن کا دل بڑھانا تاکہ استقلالِ جنگ کو نقصان نہ پہنچے اور بزرگوں کے نام پر حرف نہ آئے یہاں کوئی نسوانی کمزوری کسی خیال سے پیدا ہونے نہیں پاتی، دخترِ شیرِ خدا کو یہ اطمینان ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے خاندانِ بنی ہاشم کی جرارت و شجاعت دکھانے میں کمی نہ کریں گے۔ اب جنابِ عباسؑ کا جواب سنیئے۔ سلسلے کے دو تین بند بخیالِ طول چھوڑ دیئے گئے ہیں، بہر کیف جنابِ عباسؑ اپنی ہمشیرہ مقدسہ کی تشفی فرماتے ہیں۔

سن لیجیئے گا آپ یہ جیسے کریں گے نام — کچھ فکر کی جگہ نہ تردد کا ہے مقام
میں عبدِ سرفروش ہوں اے خواہرِ امام — ان سے کبھی جدا نہیں رہنے کا یہ غلام
بندے کا حفظ خالقِ عالم کے ہاتھ ہے
روتی ہیں آپ کیوں مری جان انکے ساتھ ہے

ایک ایک لفظ جو جنابِ عباسؑ کی زبان سے نکلا ہے ادب و قاعدہ کی پرکار سے بنا ہوا ہے اور "خواہرِ امام" یہ خطاب تو میر انیسؔ کی تخئیل کا خاص نتیجہ ہے۔ کیا جنابِ زینبؑ جنابِ عباسؑ کی ہمشیرہ نہ تھیں، پھر خواہرِ امام کہنے کی کیا ضرورت تھی مگر یہ مابہ الامتیاز لفظ ہیں جو خاص و عامِ شاعری کا فرق دکھاتے ہیں۔ میر انیسؔ نے کمال تو یہ کیا ہے کہ اِن صاحبِ اختیار بزرگوں کی زبان سے کہیں اُن خیالات کو ظاہر ہونے نہیں دیا ہے جو شانِ عبدیت کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ یہاں بھی بیت میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے یعنی جنابِ عباسؑ اپنی قوت و طاقت یا شجاعت و جرارت پر بھروسہ کر کے بچوں کی حفاظت کا وعدہ نہیں کرتے بلکہ یہ

فرماتے ہیں کہ خالقِ عالم اپنے بندوں کی حفاظت کرنے والا ہے۔وہ قوی و حافظ و نگہبان ہے تو بس وہی حفاظت کرے گا۔ ہاں البتہ جب تک میں زندہ ہوں میری جان اِن کے ساتھ ہے۔اس سے جو کچھ سمجھا جائے مگر کسی جگہ اپنے مدارج و مراتب کی اولوالعزمی پر غرور نہیں کرتے اور بحیثیتِ عبدیت حفاظت کا وعدہ فرماتے ہیں۔

اس مرثیہ میں ایک موقع پر میر انیسؔ نے جنابِ حبیب ابنِ مظاہر کے عالمِ پیری کی تصویر کھینچی ہے۔ یہ تصویر بھی مرقعِ شاعری میں ایک اعلیٰ یادگار ہے اور یہاں کیریکٹر کی شان دکھانے میں میر انیسؔ کا خیال شکسپیئر سے بھی آگے ہے۔ بمقدمۂ واقعہ اس بیت سے شروع ہوتا ہے۔

سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں
پیدل مگر تھے ابنِ مظاہر رکاب میں

عالمِ پیری کی تصویر

ابرو جھکے جو پڑتے تھے پلکوں پہ بار بار
رومال پھاڑ کر انہیں باندھا تھا استوار
چتون سے شیرِ نر کی جلالت تھی آشکار
گویا کہ تھی غلاف میں حیدرؑ کی ذوالفقار
ہمراہ دو قدم جو چلے جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے

اِک شور تھا کہ عود کیا پھر شباب نے
یا کی دعا حبیب کے حق میں جنابؑ نے
ریشِ سفید رُخ پہ سیہ کی خضاب نے
یہ آب و تاب پائی کہاں آفتاب نے
لبریز نورِ سینۂ بے کینہ ہو گیا
یوں جھریاں تنیں کہ تن آئینہ ہو گیا

نصرتِ امامؑ کی مسرت نے عالمِ پیری میں جو انقلاب پیدا کر دیا اُس کو علمِ اشارات سے

تعلق ہے۔ اس قسم کی تخئیل کی نسبت مغرب کے اہلِ قلم میں شیکسپیئر کا نمبر اول سمجھا جاتا ہے کہ وہ خصائل و معاشرتِ انسانی کے لکھنے میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے اور یہ خصوصیت ڈرامیٹسٹ ہونے کی وجہ سے شیکسپیئر کو حاصل ہے مگر شیکسپیئر اپنے ڈراموں میں بہت سے جذبات واحساسات وخصائل کو ایکٹرس سے متعلق کر دیتا ہے مگر میر انیس کے قلم میں وہ معجز نگاری ہے کہ وہ تصویر کا ترجمہ لفظوں میں کر دیتے ہیں اور یہ اُلٹی بات ہے کہ کسی نظارے کی کیفیت دکھانے کے لیے اُس کا نقشہ کھینچنے کی ضرورت ہے مگر میر انیس اُس نقشہ کا نقشہ اپنے قلم سے اس طرح کھینچتے ہیں کہ جو موشنس تصویر کے پوزیشن سے ظاہر نہیں ہوتے وہ اُن کے لفظوں سے واضح ہو جاتے ہیں۔

اب وہ وقت ہے کہ جنابِ عونؔ و محمدؔ نے صلاح کی ہے کہ سب سے پہلے ابنِ سعد پر حملہ کر کے اُس کو گرفتار کر لیں۔

چھوٹے نے کی یہ عرض کہ بڑھیئے بھی اب حضور
مخفی ہوا ہے خیمہ میں ڈر کر وہ بے شعور
ہوتا ہے اور دھوپ سے اب پیاس کا وفور
مرنا ہے ہر طرح یہ تامل ہے کیا ضرور
دو ہاتھ میں بھگا کے سواروں کو گھاٹ کے
خیمہ گرا دیں اس پہ طنابوں کو کاٹ کے

اس مکالمے سے جوشِ شجاعت و شوقِ جہاد کے جذبات دکھائے ہیں اور کمسنی کی بے چینیاں ظاہر کی ہیں پھر تیسرے اور چوتھے مصرع کا ربط بتا رہا ہے کہ باوجودِ عالمِ طفلی پہلے بچوں نے اپنا مرنا فرض و مسلم سمجھ لیا ہے اس لئے بڑے بھائی سے عرض کرتے ہیں کہ وقت ضائع نہ کیجئے۔ تمازتِ آفتاب سے غلبۂ تشنگی بڑھتا جاتا ہے جب مرنا ہی جانا ہے تو کارِ نمایاں کر کے حوصلے نکال لیں اور اس قدر جلد مر جائیں کہ بھوک اور پیاس کے صدمے ستانے نہ پائیں بیت میں اندازِ تقریر سے شجاعتِ خاندانی اور اطمینانِ جنگ دکھاتے ہیں یعنی گھاٹ کے سواروں کو دو ہاتھ میں بھگا کر ابنِ سعد پر خیمہ کاٹ کر گرا دیں گویا بچوں کے نزدیک یہ کام بہت آسان ہے۔

راکب و مرکب کی شان

وہ اُن کے اشہبوں کی رُوا رُو اِدھر اُدھر
کاوے میں پس کے مر گئے سو سو اِدھر اُدھر
تابندہ تھے جو آٹھ مہ نو اِدھر اُدھر
پھیلی ہوئی زمین پہ تھی ضو اِدھر اُدھر
کیلوں سے آشکار تھے جلوے نجوم کے
پریاں تھیں دو کہ پھر رہی تھیں جھوم جھوم کے

انتہائے فصاحتِ زبان وحُسنِ بیان یہ ہے کہ کوئی بند ردیف و قافیہ کی قید سے خالی نہیں اور پھر عجب عجب دلفریب ردیفیں پیدا ہوتی ہیں، شعرائے حال نئی ردیفیں پیدا کرنے میں کاہش کرتے ہیں اگر میر انیس کے مرثیہ سے مدد لیں تو ہر بند اور ہر بیت میں ایک خوشنما ردیف مل سکتی ہے۔ معاملہ بندی کی ضرورتیں شاعروں کو مجبور کرتی ہیں کہ مرثیہ، مثنوی، قصیدہ اِن اصنافِ سخن میں صرف قافیہ پر مدارِ نظم رکھا جائے تاکہ نظمِ معاملہ میں دقت واقع نہ ہو مگر میر انیس اِس بے تکلفی سے اِس قید کو نباہتے ہیں کہ قافیہ کا التزام بضرورتِ قافیہ محسوس نہیں ہوتا۔

تعریفِ اسپ

کیا دونوں تازیوں کی تک تازیاں لکھوں
کیوں کر روا روی میں خوش اندازیاں لکھوں
کس طرح نیمچوں کی سرافرازیاں لکھوں
کیا دونوں شاہزادوں کی جانبازیاں لکھوں
پوتے ہیں کس جری کے خلف کس ولی کے ہیں
اعلیٰ یہ مدح ہے کہ نواسے علیؑ کے ہیں

اِن باتوں پر میر انیس کو خداداد قدرت حاصل ہے شاعری کو اس قدر سہل الممتنع کیا کہ اُن کا کمال

لوگوں کی نظروں سے دُور ہو گیا ہے

آفتاب اونچا ہوا اتنا کہ تارا ہو گیا

ایک جگہ نہیں بلکہ سیکڑوں جگہ یہ مضامین نظم ہوئے مگر ہر موقع پر شاعری کی روح ایک نئے قالب میں دکھائی دیتی ہے۔ جو الفاظ خاص طور پر مناسب فنِ شاعری میر انیسؔ کی تصنیفات میں صرف ہوئے ہیں اُن پر تفصیلی تنقید تو ایک کارِ اہم ہے مگر میں اجمالی ذکر کروں گا۔ یہ بھی حیرت انگیز بات ہے کہ میر انیسؔ کی شاعری میں دو متضاد شقیں پائی جاتی ہیں آزادی اور پابندی۔ پابندی کا یہ حال کہ مرثیہ کے دائرے سے قدم باہر نہیں نکلتے اور آزادی کی یہ کیفیت کہ مسائل علومِ مختلفہ اور مضامینِ متنوعہ کا باغ لگاتے جاتے ہیں جس کا ایک ایک پھول دلفریب و نظارت بخشِ دیدۂ بصیرت ہے۔ اس مشکل کو وہ آسان کر سکتا ہے جو میر انیسؔ ہو۔

شیروں کی بو جو آئی تو گھوڑے بھڑک گئے
تیروں میں جس طرف وہ گئے بے دھڑک گئے

زخموں میں کیا مزہ تھا کہ بسمل پھڑک گئے
زندوں کے خوفِ جاں سے کلیجے دھڑک گئے

یکسر قدم سپاہ کے دریا سے اُٹھ گئے

ہونٹوں کو چاٹتے ہوئے دنیا سے اُٹھ گئے

چوتھا مصرع باعتبارِ شانِ تغزل ایک دیوان ہے اور وہیں سے بیت کا سلسلہ پیدا ہو کر چھٹے مصرع پر ختم ہو گیا ہے۔ ایسے شاعر کو غزل کہنے کی کیا ضرورت ہے جس کا مرثیہ تمام اصنافِ سخن کا مجموعہ ہو۔

"وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں"۔ یہ مثالیں موجود ہیں جن سے زیادہ دلفریب لفظ غزل کے لئے تلاش نہیں کئے جا سکتے۔ میر انیسؔ کو موقع مل جانا چاہیے۔ پھر وہ ہر دبستگی اور اپنی معلومات کا وزن دکھا سکتے ہیں۔ یہ ایک بندِ مقفّیٰ ہے، مردف نہیں مگر رنگینیٔ زبان کا لطف دیکھئے کہ یہاں قدرتاً اور اصولاً ردیف کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ کیا اعجازِ شاعری ہے!

وہ بازوؤں کا زور وہ تیغ آزمائیاں
وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں

وہ پنجوں میں سیفِ علیؑ کی صفائیاں   وہ دلولے وہ پہلے پہل کی لڑائیاں

اسم اشارہ جس سے معنیِ ترصیعی پیدا ہوں، یہ تو میرؔ مرحوم کا حصّہ ہے۔ وہؔ وہ کی تکرار شروع کرتے ہیں تو فصاحت کے آبِ حیات کا مینھ برساتے چلے جاتے ہیں۔ اس بند کے قافیے سب اسم کی جمع ہیں، صرف ایک قافیہ جمعِ فعل ہے یعنی اُس کا مصدر آزمانا ہے مگر اسمِ فاعل ترکیبی واقع ہونے کی وجہ سے قافیہ کو متروکات سے بچا لیا ہے۔ فصحائے وقت کے نزدیک جمعِ فعل اس صورت کے قافیوں میں متروک ہے مثلاً:

جائیں مشتاقوں کی لب پر آئیاں   بل بے ظالم تیری بے پروائیاں

جس غزل پر وہ صاحبِ شمشیر آپڑے   ثابت ہوا کہ فوج پہ دو شیر آپڑے

ماتھے وہ اور پیچ عمامے کے پیٹے   گیسو وہ بنتِ فاطمہؑ کے ہاتھ کے بٹے

وہ ابروؤں کے خم کہ ہلالِ فلک گھٹے   آنکھیں وہ نرگسی کہ جن سے نظر ہٹے

چہرے کسی نے دیکھے ہیں اس آب و تاب کے

رخسار، چار پھول کھلے ہیں گلاب کے

بقدرِ معلومات ہر شاعر خیالات کی رنگینیاں دکھا سکتا ہے مگر میر انیسؔ کے کلام کی قوت اوّل سے آخر تک یکساں نظر آتی ہے۔ یہ چار ہندی کے قافیے ہیں جو چاروں مصرعوں میں کس روانی اور بے تکلفی سے نظم ہوئے ہیں۔ اگر میر انیسؔ کی قوّتِ شاعری کا اندازہ کرنا ہو تو ایک پانچواں مصرع اس قافیہ میں نظم کرو۔ میر انیسؔ کے مرثیہ کی مثال یہ ہے کہ جیسے فصلِ بہار میں اشجارِ باغ کی شاخ شاخ پھولوں سے لدی ہوتی ہے اور جوشِ گل سے پھولوں کے انبار زمین کو بھی بار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح افراطِ مضامینِ شاعرانہ کے سبب سے دیدہ و دل سے قوتِ امتیاز یہ زائل ہو جاتی ہے اور کثرتِ محاسن سے ایک عالمِ حسن نظر آتا ہے۔

وہ برگِ گل سے لب وہ دہن اُن کے تنگ تنگ، یہی لفظ معشوقوں کے سراپا میں صرف

کئے جاتے ہیں مگر یہ بات قابلِ غور ہے کہ مصرعے کی شان سے معلوم ہوتا ہے کہ کمسن بچوں کا سراپا شروع ہوا ہے۔

وہ برگِ گُل سے لب وہ دہن اُن کے تنگ تنگ — وہ بھینی بھینی بُو کبھی غنچے میں نہ وہ رنگ
لعل و گہر ہیں اُن دُرِ دنداں کے آگے دنگ — اک منجمد وہ قطرۂ نیساں ہے اور یہ سنگ
تشبیہہ بھی جو اُن سے ہوئی ناامید ہیں
اس غم سے موتیوں کے کلیجے میں چھید ہیں

جستہ جستہ انتخاب کر رہا ہوں اور حیرت میں ہوں کہ ان مضامینِ جدید پر کیا تنقید لکھوں اس تنقید کو ترغیب سمجھ کر ناظرین جب میر انیس کے کلام پر بالاستیعاب نظر ڈالیں گے تو اس شاعری کا لُطف اُٹھالیں گے۔

گھوڑوں کی تعریف

آئے اِدھر سے گر تو اُدھر سے نکل گئے — پہنچے کنارِ بحر تو بر سے نکل گئے
مانندِ برق لشکرِ شر سے نکل گئے — دو شیر آگے تیرِ نظر سے نکل گئے
یوں پھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے
جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے

غنچے ہیں دو ملے ہوئے یک جا کر اُن کے گوش — برگستواں میں جسم کہ رستم ہے درع پوش
سُرعت کو دیکھ لیں تو اُڑیں طائروں کے ہوش — گرتا تھا مُنھ سے کف تو شجاعت کا تھا یہ جوش
پریاں اُڑا سکیں نہ روش اُن کی چال کی
بالکل مزاج شیر کا، آنکھیں غزال کی

وہ سُم وہ نعل اور وہ سینے وہ ترک تاز — بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہباز

صنعتِ لف و نشرِ مرتب ہے اور اس صنعت کا خاصہ یہ ہے کہ بڑے بڑے فصحاے

اخلاق پیدا ہوجاتا ہے مگر یہاں وہی رائج الوقت سکہ چل رہا ہے۔

زیور تھا ایک شب کی دُلہن کا گراں کا ساز ۔۔۔ وہ کلغیاں کہ طرۂ لیلیٰ سے سرفراز

بن کر گہر پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے

ہیکل کی تختیوں کے ستارے چمکتے تھے

سبحان اللہ فصاحت زبان و قلم سے لپٹی ہوئی ہے۔

نیمچوں کی تعریف

پیاسوں کے نیمچے بھی غضب آبدار تھے ۔۔۔ سیلِ فنا تھے صاعقہ و شعلہ بار تھے

دونوں بہم جو مل کے اُٹھے ذوالفقار تھے ۔۔۔ سایہ کو بھی شریک جو کیجے تو چار تھے

دو کرتے تھے یہ راکب و مرکب کو زین کو

دو ہاتھ کاٹ دیتا تھا سایہ زمین کو

یہ مضامین ذاتی ہیں مگر ان کا احساس کیوں کر ہو اس لئے کہ رنگینی کے خیالات کا سنہرا ملمع اصلی جوہروں کو چھپائے ہوئے ہے۔ شوکتِ الفاظ و جدّتِ استعارہ کے بعد تخیلِ ذاتی کی جانب ذہن منتقل کیا جائے تو نازک خیالیوں کا پتہ چل جائے گا۔ جس بند پر نظر ڈالتا ہوں جی چاہتا ہے کہ سلسلۂ تنقید میں داخل کروں مگر جو لطف دل کو حاصل ہوتا ہے اُس کے بیان میں قلم و زبان عاجز ہیں اور افسوس کہ مجھ ہیچمدان سے یہ فرض پورا نہیں ہوتا۔

اس مرثیہ کی ابتدا میں جنابِ عونؑ و محمدؑ علیہما السلام نے ابنِ سعد پر حملہ کرنے کی صلاح کی ہے اُس مبتدا کی خبر شاعر نے یہاں نکالی ہے۔

جا پہنچے تھے خیامِ بن سعد کے قریں ۔۔۔ بھاگا عقب سے چیر کے خیمے کو وہ لعین

کتنی طنابیں کاٹ چکے تھے یہ مہ جبیں ۔۔۔ ہاں ہاں کا شور کر کے بڑھے سب عدوئے دین

بھاگا اُدھر تو جوش میں وہ اضطراب کے

یہ تو نہال رہ گئے ہونٹوں کو چاب کے

معاملات میں یہ فصاحت و روانی خدا کی شان ہے چھٹے مصرعے میں غصے کے موشنس بھرے ہوئے ہیں اور دوسرے بند سے اُن جذبات کو متعلق کیا ہے۔

دیکھا حضور چھوٹ گیا پنجے میں آکے صید | چھوٹے نے عرض کی یہ سراپا ہے مکر و کید
فرمایا عونؑ نے یہ ہے اُستادِ زرق و شید | چھپنے کی شرم ہے نہ اُسے بھاگنے کی قید

بھاگا طناب کاٹ کے کیا حیلہ ساز ہے

سچ ہے حرام زادے کی رسّی دراز ہے

کس سمت ابنِ سعد ہے او شمرِ رُوسیاہ | بڑھ کر پکارے حضرتِ عباسِؑ عرش جاہ
روکے گئے نہ ایک سے دو طفل واہ واہ | ذلّت اُٹھا کے بھاگ گیا افسرِ سپاہ

سرسبز ہوتے ہیں ہمیں جب کھیت کٹتے ہیں

یوں لشکروں سے شیر کے فرزند لڑتے ہیں

جنابِ عباسؑ کو بچّوں کی ہمّت و شجاعت دیکھ کر جو مسرّت پیدا ہوگئی ہے شاعر نے اُس کا نقشہ کھینچا ہے۔

بھاگے گا پھر تو خیر کوئی زخم کھا تو جائے | ہاں مرد اگر ہے سامنے بچّوں کے آتو جائے
بگڑی ہوئی لڑائی کو ظالم بنا تو جائے | مخفی کدھر ہے شیروں کو صورت دکھا تو جائے

بھرے ہیں شیر ہاتھ میں تیغ و سپر تولے

گرتا ہے وہ جھکا ہوا خیمہ خبر تو لے

چھٹے مصرع کی آمد میں انیسی قوّت کا اظہار ہے اور اس سے زیادہ کچھ تعریف نہیں ہوسکتی کہ فیضانِ قدرت ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ بچّوں کی لاش سیّدالشہدا خیمہ میں اٹھالائے ہیں اور اہلبیتِ امامت میں کہرام مچا ہوا ہے۔

بیٹھی تھیں ایک گوشے میں زینبؑ جو ننگے سر | واں جا کے بر لی جاؤ نہ تا شاد و نوحہ گر
پرسے کو لوگ جمع ہیں چلیئے ذرا اُدھر | فرمایا میں نہ جاؤں گی بچّوں کی لاش پر

آنچ آ نہ کی جی کو جلائے تو کیا کروں
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

اُس ماں کے دل سے اس مصیبت کو دریافت کرنا چاہیئے جس کے دو سعادت مند فرزندوں کی لاشیں ایک ہی وقت میں آنکھوں کے سامنے ہوں اور صبر و استقلال میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

جنابِ زینبؑ کو فقط یہ خیال ہے کہ میرے غم سے بھائی کا غم زیادہ جانکاہ ہے اس لیے بھائی کے سامنے بچوں کی لاش پر جانا بھی گوارا نہیں مگر یہ سب راز میر انیس کے قلم سے کھلے ہیں۔

بس سُن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے | لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اُجڑ چکے | گودی کے جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے

اب اُن کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیئے
بی بی سلامتی علی اکبرؑ کی چاہیئے

ماں کے لئے فرزندوں کا مرنا اس لئے باعثِ مسرت ہے کہ باوجود کمسنی خاندانِ بنی ہاشم کی جرأت دکھا کر اپنا فرض پورا کر گئے۔ خاندانِ امامت کی ایک عورت کا استقلال دکھایا گیا ہے جس ارادے کو اپنے جوشِ محبت سے پورا کیا ہے اُس کے نتیجے پر غم و ملال کا اظہار باعثِ ملالِ سیّد الشہدا سمجھتی ہیں نہ یہ نکتہ کسی کے ذہن میں آسکتا ہے اور نہ کوئی شاعر اس خیال کے نظم کرنے کو ایسے لفظ پا سکتا ہے۔ آخر جنابِ شہربانو کے اصرار سے بیٹوں کی لاش پر تشریف لے گئی ہیں۔ سلسلۂ نظم چھوڑ کے صرف چند بندوں پر اُس خیال کو ختم کروں گا جس میں محبتِ مادری کے درد بھرے کنایے سُننے والوں کا دل ہلاتے ہیں۔

اُلجھے ہیں میرے ہاتھ کے گیسو بٹے ہوئے | سینے فگار چاند سے بازو کٹے ہوئے

کس طرح دیکھوں خاک میں چہرے اٹے ہوئے
ہے ہے کفن بنے یہی کپڑے پھٹے ہوئے
نہ کچھ تزک نہ تخت شہیدوں کو چاہیئے
مرنا اسی طرح سے سعیدوں کو چاہیئے

اُردو کے قافیے فصاحت کی کسوٹی پر کسے ہوئے، خاندانِ امامت کی زبان اور میر انیس کا حُسنِ بیان، واقعہ نگاری میں سلاست و متانت کی تازگی، الفاظ میں مرثیت کا درد و غم، تقریر میں صبر و استقلال کا ثبوت اس قدر جامعیت کا بوڑھے مقدس شاعر کے سر سہرا رہا ہے۔

سُنتی ہوں اس سفر میں خطر بے شمار ہیں
جانیں وہی اسے جو مسافرِ مزار ہیں
پُرسش ہے روک ٹوک ہے جنگل ہے خار ہیں
وہ بھی ڈرے ہوئے ہیں جو طاعت گزار ہیں
منزل کا شب کی ماں کو پتہ دے کے جائیو
قربان جاؤں ساتھ مجھے لے کے جائیو

نظم کے کس کس عنوان پر نظر ڈالی جائے۔ جنابِ زینبؓ کی بیقراری سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کوئی ناشاد ماں اپنے کمسن بچوں کی لاش پر بین کر رہی ہے۔ مسافرانِ عدم کے خطرات کا بیان اِس عالم میں زیادہ قابلِ افسوس ہے کہ یہ منزلِ تسلیم و رضا کے مسافر قبل از وقت کمر باندھے ہوئے تیار ہیں۔ جوان اولاد کے ماتمِ مرگ میں جو لفظ استعمال ہونا چاہیئے اُس دائرے سے اِس غم اندوز واقعہ کو جس قدر دُوری ہے اُتنا ہی فرق بتینہ لفظ ظاہر کر رہے ہیں اور اِن اشاروں سے پتھر کے قلب پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اوپر کے بند میں مسافرانِ عدم کے سفرِ آخرت کا ذکر کرنے کے بعد ماں کی زبان سے مسافروں کے خطرناک سفر کی جانب اشارہ کیا ہے۔

"دِن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو!" مسافر کے لیئے اِس وقت سے زیادہ کوئی ہولناک وقت نہیں ہوتا اور ہر مسافر پر یہ ڈراؤنا وقت اپنی بھیانک صورت کا اثر ڈالتا ہے جب کہ ایک خوفناک منزل کے مسافر کو منزل پر پہنچنے سے پہلے شام ہو جاتی ہے اور آتے

والی رات کی تاریکی اُس کے ارادوں پر عمل کرتی ہے عظیم الشان پہاڑوں کی مہیب گھاٹیوں میں ڈوبنے والا آفتاب ان غربت نصیبوں کو ہولناک وادیوں میں تنہا چھوڑ جاتا ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ مجھے شام کہاں ہو گئی اور رات کہاں بسر کرنا پڑے گی تو اُس کے اضطرابِ قلب اور پریشانیِ خاطر کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ دُنیا کے تجربے واقعاتِ عالم کا فوٹو دکھاتے ہیں جن غریب الوطنوں کو اس خوفناک نظارہ کا عملی تجربہ ہوا ہو گا اُن کا دل اس تخئیل کا مزہ اُٹھائے گا۔ خدا کی شان ہے کہ گوشۂ عزلت میں بیٹھنے والا شاعر تمام واقعات و مناظرِ عالم کی تصویر کھینچنے میں مشاہداتِ ذاتی پر سبقت لے گیا ہے وہ کمی آسمانی فرشتے پوری کرتے ہیں جو عملی تجربوں سے بہت دُور ہے۔

دن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو
کس بن میں شب کو ہو گا مقام اے مسافرو

جذبات و اثراتِ شاعری کے علاوہ مضمون کو واقعاتِ اصلی سے قدرتی مناسبت ہے اور یہی وجہ مزید اثرات کی ہے کہ وقتِ شہادت بھی قریب قریب وہی وقت ہے۔

کچھ تو کرو زباں سے کلام اے مسافرو　　بھیجو گے کب پیام و سلام اے مسافرو

پختگیِ خیالات کی کوئی حد نہیں۔ چونکہ ردیف غربت نصیبوں سے تعلق رکھتی ہے اس لئے لوازمِ حالتِ سفر کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا ہے۔

بیٹوں کی پہلوؤں میں جو تم کو نہ پاؤں گی
میں شب کو ڈھونڈتی ہوئی جنگل میں آؤں گی

چوتھے مرثیے کا انتخاب

واحسرتا کہ عہدِ جوانی گزر گیا　　ہنگامِ قوتِ ہمہ دانی گزر گیا

وہ زور و شورِ سحر بیانی گذر گیا　　　اب کیا علاج فرق سے پانی گذر گیا

پھولا ہے باغ بزم میں شیعہ بہم نہیں

افسوس مجلسیں تو وہی ہیں پہ ہم نہیں

مشہور ہے کہ یہ مرثیہ میر انیسؔ کی آخری فکروں کا نتیجہ ہے جس وقت ہوائے پیری کے جھونکے باغِ زندگانی کو پامال کر رہے تھے اُس وقت صرف ایک بند عنوانِ مرثیہ پر شاعر نے اپنی تغیرِ حالت کے متعلق لکھا ہے اور اُس کے بعد مرثیہ شروع ہو گیا ہے۔ اس مضمون پر فردوسیِ طوسی نے شاہنامہ اور نظامی گنجوی نے سکندر نامہ میں اپنی اپنی طبیعتوں کی جولانیاں دکھائی ہیں چونکہ انقلابِ عمر انسانی زندگی پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے اس لئے اس مبحث کے متعلق قدرتی طور پر شعرا کے دماغ سے مضامینِ رنگین کی تراوش ہوتی ہے اور زوالِ عمر کے ساتھ ساتھ عروجِ کمال اپنی قوّت دکھاتا ہے۔ میر انیس کو درحقیقت کافی موقع نہیں ملا کہ وہ اس (سبجکٹ) پر اپنا زور دکھاتے مگر فردوسیؔ اور نظامی کو اچھا موقع مل گیا ہے۔ خصوصاً فردوسی نے شاہ محمود کی عہد شکنی سے شکستہ خاطر ہو کر اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں اور خوشگوار حصۂ عمر کے ضائع ہونے پر مضامینِ پیری کو بڈھے شاعر نے خونِ جگر سے لکھ کر رنگین بنا دیا ہے۔ اُس طول اور اس اختصار میں مقابلتاً انقلابِ تغیرات زمانہ کے قدرتی سین کا دکھاؤ دونوں کی حسرتوں اور ناکامیوں کا برابر پتہ بتا رہا ہے۔

دریغا خطِ زندگانی نماند

مماں اے جہاں چوں جوانی نماند

عہدِ شباب اور لذتِ ایامِ جوانی کے گذر جانے پر ایرانی شاعر نے دُنیا کو بددُعا دی ہے یعنی جب میری جوانی نہ رہی تو جہان کا باقی رہنا بھی بے کار ہے اس میں وہ حسرت نہیں ہے جو فردوسیِ ہند کے زورِ طبیعت نے چھٹے مصرع میں دکھائی ہے۔ "افسوس مجلسیں تو وہی ہیں پہ ہم نہیں"۔ شاعر کے دل میں یہ حسرت ہے کہ دُنیا باقی ہے اور سامانِ دُنیا بدستور ہے۔

سامعین و قدردانانِ سخن کا مجمع بھی اُسی طرح مشتاق ہے کمال کی بہار ہے سخن فہموں کا باغ پھولا ہے۔ مگر افسوس میری جوانی کے انقلاب نے ان اسباب کو بے کار کر دیا۔ اب مجھ میں وہ طاقتِ اظہارِ فن اور قوتِ شباب نہیں کہ اگلی سی کامیابیاں حاصل ہوں۔ یہ حسرت ہے جو شاعر کی افسردہ دلی اور تلخ کامی کی دلیل ہے۔ اپنی جوانی کے گزر جانے سے لذاتِ دُنیا کا فنا ہو جانا یا موجوداتِ عالم کو بد دُعا دینا یہ ایک معمولی تخئیل ہے مگر دُنیا کی ہستی کو موجود خیال کر کے اپنے وجود و ہستی کو معدوم سمجھنا یہ رشک بلند خیالی کی خبر دیتا ہے۔ مضمون نگار اس مضمون پر بہت کچھ لکھ سکتا ہے مگر میں میر انیس کے اِس مختصر خیال پر مختصر تنقید لکھ کر مرثیہ کے اغراضِ اصلی کی جانب متوجہ ہوتا ہوں اور امام علیہ السلام کے سراپا سے شروع کرتا ہوں۔

سراپا

کیا خوشنما ہیں چہرے پہ گیسو کو دیکھیے
شب اور آفتاب کے پہلو کو دیکھیے
دو راتیں اِک سحر رُخِ نیکو کو دیکھیے
جنگل تمام بس گیا خوشبو کو دیکھیے
چہرے کی ضو سے دشت پُر آشوب عرش ہے
ساری زمیں پہ عنبرِ سارا کا فرش ہے

ایسے مقاموں پر جو میر انیس نے قوتِ شاعری دکھائی ہے وہ راقم الحروف کے نزدیک محتاجِ تنقید نہیں کیوں کہ یہ تشبیہ و استعارات کا میدان ہے اور اس قدر پامال ہے کہ ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی محاسنِ شاعری کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس سارے بند میں صرف ایک لفظ کے عارضِ زیبا پر میر انیس کی تخئیلِ ذاتی کا نقاب پڑا ہوا ہے۔ اُسے میں اُٹھائے دیتا ہوں مجھے خود حیرت تھی کہ دشت کی صفت پُر آشوب اس موقع پر کچھ دل میں چُبھنے والی بات

نہیں پھر یہ خیال ہوا کہ میر انیسؔ کے کلام میں حشو وزوائد کو کیا دخل ہے۔ نہ یہ اُن کی فصاحتِ زبان کا مقتضا ہے اور نہ اُن کے اندازِ تحریر کا خاصہ آخر بنظرِ غائر یہ معمہ حل ہوا کہ دشتِ کربلا کا بہ سببِ وقوعِ معرکۂ کربلا پُر آشوب ہونا تو مسلّم ہے مگر میر انیس کے مصرع میں یہ صفت خالی از صفت نہیں بلکہ باوجودیکہ دشتِ کربلا دشتِ پُر آشوب ہے مگر حسنِ عارضِ جنابِ امام علیہ السلام نے اپنی نورانی کیفیت سے اُس دشت کو بھی ہم پایۂ عرش بنا دیا جس میں بہ سببِ پُر آشوبی قابلیتِ قبولِ حُسن نہ تھی۔ اللھم صلّ علی محمد وآلِ محمد۔

آنکھوں کو کہیے عین تو عینِ خطا ہے یہ   پردے نہ کیوں ہوں سات کہ نورِ خدا ہے یہ

سب کو ہے چشم داشت کہ عینِ عطا ہے یہ   بیمار خود پہ سب کے مرض کی دوا ہے یہ

سرخوش بھی جام اس کی محبت کا پی گیا
دیکھا نگاہِ لطف سے جس کو وہ جی گیا

احسان بھی حیا بھی مروت بھی قہر بھی   لو موت بھی حیات بھی امرت بھی زہر بھی

بینا بھی نکتہ سنج بھی دانائے دہر بھی   تسنیم بھی بہشت بھی کوثر بھی نہر بھی

سر شرم سے جھکاتی ہے نرگس ریاض میں
جنت سواد میں ید بیضا بیاض میں

یہ معمولی سبجکٹ ہے جس پر تمام اصنافِ سخن کے شعراء نے طبع آزمائیاں کی ہیں مگر میر انیسؔ نے اِن بندوں میں غیر معمولی خوبی صرف کی ہے تعریفِ چشم میں صفاتِ اضداد جمع ہیں اور پھر وہ تشبیہیں تام ہیں آگے دو بندوں میں بلاغت کا زور دکھایا ہے اور مصرعوں کی سجاوٹ کے ساتھ مضامینِ جدید کی خوبی اور الفاظِ بلیغ کی دلفریبی میں قدرتی تاثیر پائی جاتی ہے۔

آہو شکار و مست و کماندار و شیر گیر   ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر

خوں ریز و جاں ستان و دلآویز و بے نظیر   قبضے میں ابروؤں کی کمانیں مژہ کے تیر

جس سادہ دل کو ان کی سیاہی کی یاد ہو
ناخواندہ بھی اگر ہو تو روشن سواد ہو

آہو فریب و عشوہ فروش و کرشمہ ساز | مختار و شرمگین و گراں خواب و سرفراز
حق بین و پاکباز و خدا بین و بے نیاز | بیدار و داغدیدہ و خونبار و غم طراز

گرد اس کے پھر یہ کعبۂ ایماں کا طوف ہے
بس اے انیس بس نظرِ بد کا خوف ہے

اوّل بند میں بارہ اور دوسرے بند میں پندرہ لفظ تعریفِ چشم کے استعمال ہوئے ہیں اور کل مرثیوں سے یہ مقام نکالا جائے تو کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکتا، سیر گو شعرا کا کلام رطب و یابس سے بچ نہیں سکتا، خدائے سخن میر تقی میر کے چھ دیوان سے بہتر نشتر ارباب بصیرت نے انتخاب کئے ہیں اور میر انیس کے ترکش میں کتنے تیر ہیں یہ آج تک کوئی شمار نہیں کر سکا، ان موقعوں پر میر انیس کی معلومات وقادر الکلامی کا پتہ مل جاتا ہے، اچھا اگر فرض کر لیں کہ اساتذۂ متقدمین ان صفتوں کو فرداً فرداً تعریفِ چشم کے متعلق استعمال کر گئے ہیں تو پھر دعوے کے ساتھ تین چار صفتیں ناچیز احسن ایسی پیش کر سکتا ہے جو آج تک عرب و عجم کے کلام میں نہیں پائی جائیں گی اور وہ اس وجہ سے میر انیس کے ذاتی تخیل میں داخل ہیں کہ سوائے امام حسین علیہ السلام کے اور کوئی آنکھ ان اوصاف سے متصف نہیں ہو سکتی مثلاً داغ دیدہ خونبار غم طراز۔

درجِ دہن پہ لعل و عقیقِ یمن نثار | غنچے نثار پھول تصدق چمن نثار
حسنِ بیان پہ طوطیِ شکر شکن نثار | شورِ نمک پہ شاعرِ شیریں سخن نثار

فقروں میں لطف باتوں میں لذت بھری ہوئی
قرآں کی طرح سے فصاحت بھری ہوئی

اس بند کی تعریف اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ یہ بند میر انیس کی تعریف سے منسوب کر دیا جائے۔

وہ ریشِ پاک اور وہ چہرے کی آب و تاب　　　نکلا ہے چھوڑ کر شبِ تیرہ کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب　　　رخصت ہے مل رہے ہیں گلے پیری و شباب

ہاں تا بہ عصر اور زمانِ حیات ہے
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

ان موقعوں کے انتخاب سے مضامینِ شاعرانہ کا دکھانا منظور نہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر محاسنِ فن شاعری کی اجمالی تقریظ لکھی جائے تو کتاب اندازے سے گزر جائے گی۔ یہ مقامات قدر دانانِ شاعری کے لئے بطورِ خود مشاہدہ کرنے کو چھوڑتا ہوں اور مجملاً ان مضامین کا اقتباس محض اس غرض سے کرتا ہوں کہ میر انیس کے اصنافِ سخن کی مثالیں قائم ہوتی چلی جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو شعراء کا کوئی قدم میر انیس سے آگے نہیں پڑا ہے بلکہ وہ اس صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے لغزش کرتے ہیں جس کو فاضل شاعر بے تکلف طے کر رہا ہے اور منازلِ شاعری کے تنگ و تاریک راستے میں پیچھے آنے والوں کے لئے چراغ جلا گیا ہے۔

عذر و اضطرارِ فوج کی اعلےٰ مثالیں

بھڑ کے فرس پرے ہوئے ابتر علم ہٹے　　　بڑھتے تھے جو وہ بانیِ ظلم و ستم ہٹے
نامی نشان چھوڑ کے ثابت قدم ہٹے　　　دریا ہٹا کہ فوج کے بادل بہم ہٹے

بھاگڑ میں خاک اڑ کے جو سوئے فلک گئی
لشکر میں غل ہوا کہ زمیں بھی سرک گئی

خاک کا اڑنا زمین کا سرکنا نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کا نام مضمونِ ذاتی ہے ایرانی شاعر سے تقابل کیا جائے جو اس کے کلام میں محض مبالغہ پایا جائے گا ؎

زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

تعریفِ شمشیر

گھوڑا جو پھاند کر صفِ اوّل سے مِل گیا　　تھا صاعقہ کہ شام کے بادل سے مِل گیا
وہ پیلا جو فوج کے اُس دَل سے مِل گیا　　بے برگ و بر ہوئے یہ ثمر پھل سے مِل گیا

پھرتے ہوئے تنوں پہ نہ سر تھے نہ ہاتھ تھے
گویا چھری لیے ملک الموت ساتھ تھے

وہ منھ کہ الحذر وہ روانی کہ الاماں　　وہ گھاٹ الحفیظ وہ پانی کہ الاماں
وہ دم وہ خم وہ تیز زبانی کہ الاماں　　وہ دِل شکن وہ دشمنِ جانی کہ الاماں

ناز اُس کے سب کو بھائے کرشمے بھلے لگے
چھوڑے نہ بے لہو پیے جس کے گلے لگے

یہ الفاظ وہ خزینۂ جواہر ہیں جن کی کنجی میر انیس کی زبان ہے اور یہ شاعری کا وہ طلسم ہے جس کی لوح میر انیسؔ کا قلم۔ چوتھے مصرع کے انداز سے رنگِ تغزل پیدا ہو گیا تھا اس لئے بیت میں بھی وہی رنگ نباہا ہے۔

تھی دستگاہِ خاص اُسے قتلِ عام میں　　بے دم ہوا جو آ گیا جوہر کے دام میں
کس کس ادا سے چلتی تھی وہ فوجِ شام میں　　دونوں زبانیں ایک سی تھیں اپنے کام میں

کیا بس چلے کسی کا ہوا جب بُری چلے
چلتی تھی یوں کہ حلق پہ جیسے چھری چلے

باوجود سیریِ نظم مناسباتِ لفظی اور محاسنِ معنوی کا کس قدر لحاظ رکھتے ہیں قدرتی زورِ طبیعت اور جذباتِ شاعری کا طوفان کسی جگہ فرو نہیں ہوتا یہ کارنامے میر انیسؔ کی بے مثالی کی دلیلِ قاطع ہیں۔

گھوڑے کی تعریف

خوشرو و خوشخرام و خوش اندام و خوش لجام   خوش خو و خوش جمال و ادا فہم و تیز گام

پہلے مصرع میں چار صفتیں ہیں جو اصولِ ترکیبی سے صفت بحالِ متعلق واقع ہوئی ہیں مگر لفظِ خوش کی تکرار اور اندام و خرام و لجام کے الفاظِ ترکیبی نے مقفّٰے صورت میں فصاحت کا غیر معمولی لباس پہنا ہے اور دونوں مصرعوں میں صنعتِ تقابل بھی موجود ہے۔

جاندار و شوخ چشم و سعید و خجستہ کام   گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و لالہ فام

یہ وہ صنعتیں ہیں جن پر شعرائے اعجام کو فخر ہے مگر اللہ اللہ میر انیس کی معلومات کہ ایک ایک بند گھوڑے کی تعریف کا نصاب بنا دیا ہے زبانِ اُردو اِن صنائع کے برتنے سے بوجہ کم بضاعتی قاصر بیان کی جاتی ہے۔ قاآنی کا وہ قصیدہ جس کی فصاحت و بلاغت پر ایرانی شاعر کو ناز ہے اُس کا صرف ایک مصرع پیش کر کے میر انیس کے ایک مصرع سے مقابلہ کرتا ہوں اور خوبی و دلفریبی کا فیصلہ اربابِ بصیرت پر چھوڑتا ہوں۔

قاآنی:- لطافت خیز و عنبر بیز و عنبر ریز و عنبر زا۔

انیس:- گلپوش و تیز ہوش و سمن گوش و لالہ فام۔

وہاں عنبر کی تکرار نے اُس لطافت کو کھو دیا ہے جو یہاں اسمِ فاعل ترکیبی اور صفت بحالِ متعلق کے دونوں لفظوں کے تغیر سے آشکارا ہے الفاظِ جدید نے ہر مثال میں لطفِ جدید پیدا کیا ہے:

غازی تھا سرفراز تھا عالی دماغ تھا   گویا ہوا کے دوش پہ اِک زندہ باغ تھا

تلوار کی تعریف

گر طبع میں کسی کے روانی ہوئی تو کیا　　کیا کہہ سکے گا تیز زبانی ہوئی تو کیا
بالفرض قوتِ ہمہ دانی ہوئی تو کیا　　مثلِ انیسؔ سحر بیانی ہوئی تو کیا

فقروں کا ذوالفقار کے مطلب عیاں نہ ہو
کٹ جائے ساری عمر تو شمہؔ بیاں نہ ہو

صنعتِ مراعات النظیر لکھنے والے اس طرح لکھتے ہیں دیکھو میر انیسؔ کے کلام میں صنعت شاعری کی روح وجان ہے، علامہ شبلی کو غلط فہمی ہوئی ہے جو انہوں نے موازنۂ انیسؔ و دبیر میں صنعتِ مراعات پر ابتذال کا اعتراض کیا صنائع کو بطریقِ استحسان صرف کرنا شاعر کا کام ہے ورنہ ہر صنعت مبتذل ہو جاتی ہے۔ علامہ شبلی کے اقوال میں میر انیسؔ کا یہ مصرع ؎

کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

معرضِ اعتراض میں ہے۔

وہ فرماتے ہیں صنعتِ مراعات النظیر کے مصرف نے اس مصرع میں ابتذال پیدا کر دیا کیونکہ (چھینٹوں میں آنا) ایک عامیانہ محاورہ ہے اوّل تو اس محاورہ میں کوئی عامیانہ طریقِ استعمال پیدا نہیں ہوتا اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ امر تسلیم کر لیا جائے کہ یہ محاورہ عامیانہ ہے تو پھر میر انیسؔ کی کیرکٹر نگاری کی تعریف زیادہ کرنا پڑے گی اور اسی تخیئل سے شکسپیر نے وہ مرتبہ حاصل کیا ہے جس نے اسے لندن کے شعرا میں اوّل اور ممتاز بنا دیا ہے یعنی کیرکٹر نگاری اگر اپنے کسی ڈراما میں ایک جہاز ران کا پارٹ لکھتا ہے تو یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اُس نے خود تمام عمر جہاز رانی کی ہے یا علم جہاز رانی کا عالم ہے اور ایک چمار کا پارٹ لکھنے کے وقت ادنیٰ طبقے کا کیرکٹر اور لٹریچر دکھاتے ہیں وہ اُس کے طرزِ معاشرت و خصائل

وجذبات کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ میر انیسؔ کے خیال میں ابنِ سعد ایک عامی شخص ہے جو
جنّت و دوزخ کی کوئی اصل نہیں سمجھتا اور امام علیہ السلام کی طرف داری کرنے والوں کو اپنی
بدنفسی سے بہکا کر یا تو کوثر و جنّت کو ایک دِل خوش کن خیال ثابت کرنا چاہتا ہے یا یہ ثابت
کرنا چاہتا ہے کہ امام علیہ السلام میں عطائے کوثر و جنّت کی قابلیت نہیں ایسا شخص اگر بازاری
آدمی نہیں تو اور کیا ہے۔ بس میر انیسؔ کی شاعری نے مبتذل حرکات کی تصویر کھینچنے کے لئے
ایک بازاری شخص کی زبان سے بازاری یا سُوقی محاورہ استعمال کیا ہے۔ اصل اعتراض نے میر انیس کی شاعری کی اصلی
نوعیت کا اظہار ناظرین پر کر دیا اور یہ وہ باتیں ہیں جن پر ابھی تک پردہ پڑا تھا۔ آج تک میر انیسؔ
کے اس مصرع پر بحیثیت استعمالِ محاورہ لوگوں کی نظر پڑتی رہی ہوگی مگر اب بحیثیت کیرکٹر نگاری
دیکھیں گے کہ ہندوستان کا شکسپیرِ لندن کے شکسپیر سے کسی بات میں کم نہیں۔

سپر کی تعریف

دارالامانِ کعبۂ نُصرت ہے یہ سپر	پشت و پناہِ شاہِ ولایت ہے یہ سپر
لاریب فیہ آیۂ رحمت ہے یہ سپر	حقّا سوادِ اعظمِ شوکت ہے یہ سپر

پرتو فگن ہے یوں کبھی روئے جناب پر
آجائے جیسے ابرِ سیہ آفتاب پر

تعریفِ بلاغت کی مثال میں میر انیسؔ کا یہ بند پیش کرنے کے لائق ہے چند غیر مانوس لغات
کا جمع کرنا اور بے ضرورت شوکتِ الفاظ کا ملمع چڑھانا اس کو بلاغت نہیں کہتے لیکن مشکل تو
یہ ہے کہ میر انیسؔ کے شاہدِ بلاغت کے رُخِ روشن پر فصاحت کی نقاب پڑی رہتی ہے۔
اس وجہ سے حسنِ دل افروز اپنی مدھم شعاعیں باہر ڈالتا ہے اور وہ باریک بین شعرا
کو محسوس ہوتی ہیں۔

اب وہ وقت ہے کہ لشکرِ کفار میں آثارِ ہزیمت پیدا ہیں اور ایک پہلوان فوجِ مخالف سے نکل کر ابنِ سعد کی بزدلی کی شکایت کرتا ہے۔

اُس سے یہ ڈر جو غم سے ہو خود مرگ کے قریب ۔۔۔ تنہا نہ کوئی دوست نہ ہمدرد نہ حبیب
محتاج فاقہ کش وطن آوارہ و غریب ۔۔۔ بکیس عزیز مردہ بلاکش بلا نصیب

دانہ سوائے اشک فشانی ملا نہیں
غربت میں تین روز سے پانی ملا نہیں

بازو شکستہ دردِ جگر میں کمر میں خم ۔۔۔ بیٹی کے رانڈ ہونے کا صدمہ پسر کا غم
اِک جان لاکھ تیر یہ تلواریں ایک دم ۔۔۔ اب تک گرا نہیں یہ تھمیں کس طرح قدم

طاقت نہ قلب میں ہے نہ ہاتھوں میں زور ہے
پھر اُس پہ الاماں کا ہزاروں میں شور ہے

سب سے پہلے تو وہ لفظ جو ایک دشمن نے سیدالشہداؑ کی شان میں استعمال کئے ہیں اُن کا با محل تصرف دیکھا چاہیئے۔ ایک ایک لفظ سے ایک ایک عزیز و رشتہ دار کے غمِ مرگ کا اظہار ہو رہا ہے۔ اُس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ میر انیس واقعاتِ تاریخی پر کیسی روشنی ڈالتے ہیں اِس راز کی جانب خیال رجوع ہوتا ہے کہ جو شخص بارادۂ قتلِ امام حسینؑ ابنِ سعد سے اذنِ جنگ طلب کر رہا ہے وہ خود بھی امام علیہ السلام کی مظلومی اور بے کسی سے واقف ہے۔ اگر یہ تصور تسلسلِ خیال کے ذریعے سے اپنے اصلی مرکز تک پہنچایا جائے تو اُن خوفناک سازشوں کا اثر ناظرین کو بے چین کر دے گا جن کی ہولناک اور پُر فریب کارروائیاں بہت پہلے گذرنے والا زمانہ اپنے ساتھ لے گیا اور روزِ عاشورہ کے پُر آشوب دن پر اُن مظالم کا خاتمہ ہو گیا جس کی دیرینہ لیسی، انواع و اقسام کی دغاؤں سے بھری ہوئی تھی اور جس کا تخم خود اہلِ اسلام کے ایک خطرناک طبقے نے بو دیا تھا۔

مجھے شرم آتی ہے کہ مسلمان ہو کر اُن مسلمانوں کے جابرانہ عمل اور خونریز کارروائیوں

کا ذکر کرنے پر مجبور ہوں کہ جو خدا کی خدائی اور محمدؐ کی رسالت پر ایمان لائے تھے مگر مشیت ایزدی میں یہی تھا کہ یہ افسانہ خونِ ناحق شہدائے کربلا کی روشنائی سے تاریخ کے صفحوں پر لکھا جائے اور اُمتِ رسولؐ کے اُس فرقے کا ذکر نفرت ناک الفاظ میں کیا جائے جن کی خونخوار تلواروں نے صرف آلِ رسولؐ ہی کی گردنیں نہیں کاٹیں بلکہ ہمیشہ کے لئے اسلام کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے یہ قدرت میر انیس کے قلم میں ہے کہ وہ اپنی ذاتی شاعری کے ذریعے سے ظالم و مظلوم کا وہ مرقع دکھا دیتے ہیں جس کا نظارہ قومِ عرب کے لئے ایک شرمناک تاریخ ہے انسانی عداوت کے اس سے زیادہ جذبات ناٹک کے اسٹیج پر ایک قاتل کا پارٹ لینے والا ایکٹر بھی نہیں دکھا سکتا ایک انسان دوسرے انسان کی بھوک اور پیاس کا احساس کرنے پر بھی اپنی بزدلی کے مکروہ چہرے پر شجاعت کا غازہ لگانے کا ارادہ کرتا ہے اور اُن مظالم کو جرات و شجاعت سے تعبیر کرتا ہے جن کا ارتکاب محض بہ طمعِ دُنیا کیا گیا ہو۔ وہ حرص و ہوس کی اُس منزل کو بہت شادمانی سے طے کر رہے تھے جس کے راستے میں خاندانِ بنی ہاشم کی مقدس لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ تین روز کی بھوک اور پیاس میں سوکھی ہوئی زبان اور ہونٹوں پر پانی کے چند قطرے ٹپکانے کے عوض آبِ خنجر سے تواضع کرنا اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔

تشنہ بودم زدم تیغ تو آبم دادند
در جوابِ لبِ لعلِ تو جوابم دادند

شہادتِ مظلومِ کربلا وہ آخری شہادت ہے جس کے بعد خاندانِ رسالت کی فہرست میں کوئی نام باقی نہ رہا جو ایسے عبرت خیز و حسرتناک قتل کا نظارہ پیش کرے بہت سے نازک اندام بچے جن کی اُٹھتی جوانی کو غنچۂ نارسیدہ کی طرح موت کی بادِ سموم نے خاک میں ملا دیا جب وہ جوانی کی میٹھی نیند سونے والے ایک دلفریب ادا سے فرشِ خاک پر آرام کر رہے تھے تو اُن ناکردہ گناہوں کی قبل از وقت موت پر کسی بے رحم کو رحم نہ آیا اور جو دلِ ہزاروں تیرِ ستم کا نشانہ بنا ہوا تھا اُس کو اپنے تیروں اور برچھیوں کی نوکوں سے بھی زخمی کرنے میں دریغ

کیا یہ واقعہ قومِ عرب کی حمیت و مروّت پر ایک شرمناک دھبّہ ہے جس کو عظیم الشان سمندر اپنی طغیانی سے نہیں دھو سکتا اور نہ آتشِ دوزخ کے شعلے اُس کے جلانے کو کافی ہو سکتے ہیں۔ بس آپ کا سلسلۂ خیال واقعاتِ اصلی کی جانب منتقل کرنے کے بعد میں اُس نتیجے کی طرف عود کروں گا جس کو کارپردازانِ قضا و قدر نے روزِ ازل دفترِ مشیّت میں قلمبند کر لیا تھا۔ اور آپ کے سامنے وہ نقشہ پیش کئے دیتا ہوں جو ہندوستان کا مقدّس شاعر اپنے قلم سے کھینچ گیا ہے۔

غرقِ عرق تھے کانپ رہا تھا بدن تمام
نالتے میں دیر تک جو لڑے شاہِ تشنہ کام
آنکھیں تھیں بند ہانپتا تھا اسپِ تیز گام
ہاتھوں سے چھوڑ دی تھی جو راہوار کی لگام
غش میں سوارِ دوشِ نبیؐ کا یہ حال تھا
بے تھامے خود فرس سے اُترنا محال تھا

اس سے پیشتر کہ میرانیس کے اِس بند پر کوئی نقّادانہ خیال ظاہر کیا جائے یہ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرانیس کی ”سینری“ کا ذکر خاص طور پر کر لیا جائے۔ سینری کیا چیز ہے اور سین کیوں کر لکھا جاتا ہے۔ یہ بڑے قوّت دار قلم اور عالی دماغ شاعر کا کام ہے کہ کسی سین کے لکھنے میں تشبیہ و استعارات سے اپنے مضمون کو بچائے تاکہ مناظرِ اصلی کی شان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ ناولوں کی سینری میں جو روشوں کی زلفیں اور ماہ وشوں کے نورانی رخساروں کا ذکر نہ ہو تو شبِ ہجر کی تاریکی اور شبِ وصل کی چاندنی رات کا سماں ناتمام رہ جاتا ہے۔ اور اصلی نظارے کے متعلق بہت کم دلچسپی باقی رہ جاتی ہے۔

عشقی جذبات چونکہ ہر طبیعت میں فطرتاً موجزن ہوتے ہیں اس لئے ناظرین کی طبیعت ان دلفریب استعاروں پر لوٹ ہو جاتی ہے ورنہ جذباتِ فطری اور مناظرِ اصلی کو ان رنگ آمیزیوں

لہ ”سینری“ وہ چیزیں جو کسی نظارے سے متعلق ہوں۔

سے بالکل مغائرت ہے اور یہ محض پُرانی شاعری اور پرانے خیالات ہیں جن پر کسی قدر نئے طرزِ تحریر کا ملمع کیا ہوا ہے مگر ہم اپنے ناظرین کو جذباتِ اصلی اور خصائلِ انسانی کی وہ جیتی جاگتی تصویر دکھاتے ہیں جو میر انیسؔ کے زبردست قلم سے کھینچی گئی ہے۔

فاقے ہیں دیر تک جو لڑے شاہِ تشنہ کام　　عرقِ عرق تھے کانپ رہا تھا بدن تمام
ہاتھوں سے چھوڑ دی تھی جو رہوار کی لگام　　آنکھیں تھیں بند اور تھا اسپِ تیز گام
غش میں سوارِ دوشِ نبیؐ کا یہ حال تھا
بے تھامے خود فرس سے اُترنا محال تھا

خدا اثر دے وہ اثر جو خدا کے اختیار میں ہے اور اُس کی بخشش سے شاعر کے قلم میں ساری ہوتا ہے۔ مرثیے میں شہادت کا ابھی پورا حصّہ باقی ہے مگر جو اثرات واقعات کے متعلق شاعر نے ان دو بندوں میں بھر دیے۔ اُن کی مثال دوسروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اب ہم دوسرا بند لکھ کے اِس اعجازی شاعری کی داد صاحبانِ علم کے انصاف پر چھوڑتے ہیں۔

دیکھا جو یہ کہ بھاگ گئے رن سے حیلہ ساز　　تلوار رکھ کے میان میں بولے شہِ حجاز
مہلت ہے اے حسینؑ پڑھو عصر کی نماز　　یہ آخری ہے بندگیِ ربِّ بے نیاز
فکرِ نجاتِ امّتِ خیر البشر کرو
سوکھی زبان کو ذکرِ الٰہی میں تر کرو

اس بند میں صبر و استقلال تسلیم و رضا شجاعت و عبادت کے جوہر دکھائے ہیں اگر کسی دلِ میں انسانی ہمدردی کی استعداد ہو جو لطیف جوہرِ افرادِ انسانی ہے تو میر انیسؔ کی اِس تخئیل سے قلب و جگر کے ہزاروں ٹکڑے ہو سکتے ہیں جس کا ہر ٹکڑا دستاویزِ نجاتِ اہلِ ایمان ہے۔ اُس ہنگامِ حسرت و یاس میں کہ امامِ مظلوم کی نظریں اُن شہید ہو جانے والے عزیز و انصار کی نورانی صورتوں کا نظارہ کر رہی ہیں جو خدا کے بچھائے ہوئے فرشِ خاک پر ابنڈا اینڈ کر سو رہے ہیں اور اب صرف صبحِ محشر کے آفتاب کی تند و تیز شعاعیں اُن کو جگائیں گی اور آج جنّت

کی ولفزیب حوریں اُن کے مجروح سروں کو اپنے زانو پر لیے ہوئے عارضِ روشن کی بلائیں لے رہی ہیں امام علیہ السلام مکالمہ فرماتے ہیں۔

رُوحانی مکالمہ

ناگاہ سوئے لاشِ پسر جا پڑی نظر — چلائے دل کو تھام کے سلطانِ بحر و بر
سوتے ہو کیا دھرے ہوئے رخسار خاک پر — اکبرؑ اُٹھو کہ گھوڑے سے گرتا ہے اب پدر
بھولے پدر کو نیند میں قربان آپ کے
آؤ نمازِ عصر پڑھو ساتھ باپ کے
عباسؑ نامدار ترائی سے اُٹھ کے آؤ — پھنکتا ہے قلب جل رہے ہیں سب جگر کے گھاؤ
پھر دکو مری زرہ پہ جو پانی کہیں سے پاؤ — چلتے ہوئے عدم کے مسافر سے مل تو جاؤ
ہم سب کے کام آئے ہیں بیٹھے ہیں روتے ہیں
بارہ پہر ہوئے کہ نہ لیٹے نہ سوئے ہیں
گویا فضا یہ سرد ترائی ہے اب اُٹھو — ہم جاں بلب ہیں ختم لڑائی ہے اب اُٹھو
نرغے میں فوجِ ظلم کے بھائی ہے اب اُٹھو — عباسؑ دھوپ چہرے پہ آئی ہے اب اُٹھو
غفلت کی تم کو نیند ہے شبیرؑ کیا کرے
میری طرح کسی کو تڑپے کس خدا کرے

وفادار بھائی کی لاش پر امام حسینؑ کی نظر کب پڑی ہے جب مغرب کی جانب جھکنے والے آفتاب کی آخری شعاعیں اُس بہادر جوان کے نورانی چہرے سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ اس لئے فرماتے ہیں (عباسؑ دھوپ چہرے پہ آئی ہے اب اُٹھو) اس مغربی مسافر کے اشتیاق و انتظار کی روشن دلیل ہے کہ اُس تنگ وقت میں بھی ابوالفضل عباسؑ کے خوبصورت چہرے

بلائیں پینے کو ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ استغاثہ ہے امام علیہ السلام کا جس سے آسمانی فرشتوں نے بھی پناہ مانگی ہے۔ پانچواں مصرع اپنے اثرِ بیان سے جگر و دل کو فشار دیتا ہے (غفلت کی نم کو نیند ہے شبیرؑ کیا کرے) کس قدر مجبوری اور مایوسی ہے۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ سید الشہداؑ کثرتِ زخم و فرطِ مصائب سے اس قدر کمزور تھے کہ وفادار بھائی کو موت کی غافل نیند سے جگا نہیں سکتے یا یہ سمجھا جائے کہ خوابِ مرگ وہ نیند ہے کہ جس سے چونکنا ممکن نہیں اس لئے فرماتے ہیں کہ شبیرؑ کیا کرے اور چھٹا مصرع اظہارِ حال کے علاوہ تمام بندگانِ خدا کے لئے امام کی دعا ہے۔ (میری طرح کسی کو نہ بے کس خدا کرے) اپنی بے کسی اور مظلومی کا اندازہ کرکے امتِ رسولؐ کے لئے دعائے خیر فرماتے ہیں۔ دنیا کے شاعروں کو اُس قلم پر رشک ہونا چاہیے جس سے یہ خیالات ٹپکتے تھے اور اُس محدود چار دیواری کا طواف لازم ہے جہاں آسمانی فرشتے یہ وحی لے کر آتے تھے۔

پانچویں مرثیے کا انتخاب

آج میری تنقید کا پانچواں نمبر میرے ہاتھ میں ہے اور اس نمبر میں میر انیسؔ کا وہ مرثیہ ہے جو فصاحت زبان اور سلاستِ روزمرہ کے اعتبار سے زبانِ اردو کا ایک لُغت یا نصاب ہے۔ ہر چند یہ تعریف میر انیسؔ کے لئے معمولی ہے اور اُن کا کلیات اس صفت سے مالا مال نظر آتا ہے مگر طرزِ تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس مرثیے میں مصنف نے چند ایسی خوبیوں کے اظہار کا ارادہ کیا ہے جو اور مرثیوں سے بچی ہوئی تھیں اور یہ وہ خاص باتیں ہیں جو میر انیسؔ کے کلام کو شناخت کراتی ہیں۔ جواہرِ کلام کے پرکھنے میں اگر نقاد کوئی فروگذاشت کرے تو یہ اُس کے مذاقِ سلیم کا قصور ہے ورنہ تصنیفات محاسنِ شاعری سے معمور ہیں۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

سیدِ مرحوم کی تقلید میں آج تک ہزاروں طبیعتوں کی مشینوں کو سخت حرکت دی گئی ہے اور کس قدر کامیابی ہوئی یہ میں نہیں بتا سکتا۔ دُنیا اہلِ علم اور اہلِ کمال سے خالی نہیں لہٰذا جو زبردست قوتیں شعرائے حال نے دکھائی ہیں وہ واقفانِ فن اور ماہرانِ رموزِ شاعری کے نزدیک قابلِ تحسین ولائقِ قدر ہیں لیکن جن اہلِ قلم کو علومِ مختلفہ کے پرپرواز عرشِ معلیٰ تک پہنچا دیتے ہیں وہ وہاں پہنچ کر بھی اُس ودیعت سے محروم رہتے ہیں جو ہر انسان پیدائش کے روز اپنے ساتھ لاتا ہے اور قدرت کا انتخاب ایک امتیازی فرق دکھاتا ہے۔ زمانۂ حال کے مرثیہ گو اپنی انتھک کوششوں سے ایک خاص رنگِ شاعری کے مالک بن گئے اور ان کے بعد دُنیا میں آنے والے کچھ اور تغیر و انقلاب دکھائیں گے ایجاد جس چیز کا نام ہے اُس سے دُنیا خالی نہیں اور نہ ہوگی مگر گذر جانے والا زمانہ جن یادگاروں کو اپنے ساتھ لے گیا اُن کے عود کرنے کی امید نہیں۔ یہ سہرا اُنہیں لوگوں کے سر پر باندھا گیا ہے اور یہ لباس انہیں مقدس اہلِ کمال کے جسم پر ٹھیک اُترا ہے اور یہ شرف انہیں سال و ماہ کی قسمت میں لکھا گیا ہے جو ترقی معکوس نہیں کر سکتے۔ نظامِ عالم کی مشینری حسبِ دستور اپنا کام کر رہی ہے۔ دن کو آفتاب اور رات کو چاند تارے اپنے معمولی محور پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ مگر آج کا دن کل کے روز سے مشابہت نہیں رکھتا اور نہ کوئی سائنٹسٹ وقت کی طنابوں کو کھینچ کر زمانۂ حال کو حادثاتِ زمانۂ ماضی سے ملا دے سکتا ہے۔ ہر ایک بخششِ قدرت اپنے اثرات میں کسی دوسری چیز کو شریک نہیں کرتی۔ موجودہ حضرات نے صنفِ مرثیہ میں جس قسم کی جدت و تازگی دکھائی واقعی وہ میر انیسؔ کے میدانِ شاعری سے بہت فاصلے پر ہے۔ جب وہ شاعر دبیرؔ ہی کی تقلید میں ناکامیاب رہے تو اُن کی شاعری نے ایک نیا پلٹا کھایا اور دوسرا قالب بدلا یعنی مسائلِ فلسفہ کے گل ہائے متنوعہ سے رنگا رنگ گلدستے بنائے اب ہم کو یہ بات ظاہر کر دینے کی ضرورت ہے کہ میر انیسؔ اس ایجاد و اختراع میں قاصر نہ تھے جو شعرائے زمانۂ حال کے لئے سرمایۂ ناز ہے مگر ترقیِ جدیدہ اور مسلکِ انیسی میں ایک بڑا ہی فرق نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ فاضل شاعر نے بھی اکثر مرثیوں کے چہروں کو

مضامینِ بلند سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے بلکہ ایک ایک مصرع بجائے خود مسئلۂ فلسفہ ہے تاہم مقاصدِ مرثیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور تشبیبِ مرثیہ میں براعتِ استہلال کا مقصود ضائع نہیں ہونے دیا ترقیٔ جدیدہ کے اہم مسائل جو بادی النظر میں ایک علمی مضمون کی حیثیت سے سامعین و ناظرین پر اثر ڈالتے ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ صنفِ مسدّس میں ایک فلسفی نے چند مسائلِ فلسفہ پر بحث کی ہے۔ اب خواہ اس کو مرثیہ کہو یا انسائیکلوپیڈیا سمجھو یہ تمہیں اختیار ہے۔ مضامین کے اعتبار سے اہل علم کی تصنیفیں کسی درجے کی ہوں مگر میر انیس کے مرثیے سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہاں تو مرثیے سے بحث ہے اور مرثیے کا دائرہ وہی ہے جس کی حدیں فاضل شاعر نے کھینچ کر نقشہ بنایا ہے اور اُس نقشے کے عنوان پر جلی قلم سے لکھ دیا ہے "اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے" ہم یہ نہیں کہتے کہ کوئی شاعر مرثیہ لکھنے کے لئے میر انیسؔ کی سی قوّتِ شاعری پیدا کرے تو اس میدان میں قدم رکھے کیوں کہ یہ بات انسانی طاقت کے خلاف ہے اور محض فیضانِ قدرت۔ مگر کم از کم مرثیہ کے ارکان قائم رکھنے کے لئے فاضل شاعر کی تقلید کی ضرورت ہے۔ کلام جب میر انیسؔ کے معیار پر پورا اُترے تو زرِ خالص سمجھا جائے گا۔ اور اس کی مقبولیت زمین سے آسمان تک ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعرائے حال اپنی تصنیف کا ایک جداگانہ انداز قائم کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ گوئی گورنمنٹ قانون یا مسئلۂ شرع اُن کو ان پابندیوں پر مجبور نہیں کرتا تو پھر ہم بغیر جواب دیے خاموش نہیں رہ سکتے کہ ایسی تصنیف کا نام مرثیہ رکھ کر باوجودِ مغائرتِ نوعیت و مباینتِ صنفیتِ مرثیہ کے داد کیوں طلب کی جاتی ہے اور اردو علم و ادب کے رسالوں کی رونق بڑھا کر علمی دُنیا کے نوجوانوں کو فائدہ کیوں نہیں پہنچایا جاتا۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں راہ تو میروی بہ ترکستان است

رُوحانیات

پیری پہ مری رحم کر اے خالقِ ذوالمنن / مٹے جلد ہو اب مرحلۂ خنجر و گردن
قتلِ علی اکبرؑ کی خوشی کرتے ہیں دشمن / تجھ پر مرے اندوہ کا سب حال ہے روشن
مظلوم ہوں مجبور ہوں مجروح جگر ہوں
تُو صبر عطا کر مجھے یارب کہ بشر ہوں

نوجوان فرزند کی موت پر پابندِ رضائے الٰہی امام علیہ السلام درگاہِ باری میں صبر کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں منزلِ تسلیم و رضا کی شان دکھائی ہے۔

پھر لاشۂ اکبرؑ نظر آئے تو نہ روؤں / برچھی جو کلیجے میں در آئے تو نہ روؤں
دل دردِ محبت سے بھر آئے تو نہ روؤں / سو بار جو منھ تک جگر آئے تو نہ روؤں
شکوہ نہ زباں سے غمِ اولاد میں نکلے
موتی ہے وہ آنسو جو تری یاد میں نکلے

اُس عالمِ حسرت و یاس میں جنابِ زینبؑ کو سمجھاتے ہیں اور صبر کی ہدایت فرماتے ہیں اس مقام پر یہ تصنیف فصاحتِ زبان کے جواہر سے مرصع ہے۔

کس کس کی نہ دولت پہ زوال آگیا زینبؑ / پابندِ رضا تھا جو شرف پا گیا زینبؑ
دُنیا سے گیا جو تنِ تنہا گیا زینبؑ / کھلتا نہیں وہ پھول جو مرجھا گیا زینبؑ
جو منزلِ ہستی سے گیا پھر نہیں ملتا
یہ راہ وہ ہے جس کا مسافر نہیں ملتا

میں کون ہوں اک تشنہ دہن بیکس و محتاج / بندہ تھا خدا کا سو ہوا ہوں میں طلب آج
وہ کیا ہوئے جو لوگ تھے کونین کے سرتاج / نہ حیدرؑ کرار ہیں نہ صاحبِ معراج

کچھ پیٹنے رونے سے نہ ہاتھ آئے گا زینبؑ

آیا ہے جو اس دہر میں وہ جائے گا زینبؑ

دیکھنے کی بات ہے کہ یہ مضامین بطورِ خود مسائلِ تسلیم و رضا ہیں اور یہ خیالات واقعاتِ عالم سے متعلق ہیں۔ استقلال وصبر، تسلیم و رضا، موت، بے ثباتیِ عالم مگر مرثیت کو کس قدر دخل ہے۔ یہ ترتیب ہر ایک شاعر سے قائم نہیں رہ سکتی۔ امام علیہ السلام کے خیالات دکھا کر میر انیسؔ نے کمزور طبیعت والے انسانوں کو استقلال وصبر کا سبق دیا ہے۔

قاتل جو چھری خشک گلے پر مرے پھیرے　　خالص رہے نیت کوئی تشویش نہ گھیرے

کٹنے پہ رگوں کے یہ سخن لب پہ ہو میرے　　قربان حسینؑ ابنِ علیؑ نام پہ تیرے

بہنوں کی نہ ہو فکر نہ بچوں کی خبر ہو

اس صبر سے سر دوں کہ مہم عشق کی سر ہو

اِس کے بعد امام علیہ السلام اہلبیتؑ سے رخصت ہو کر خیمے سے باہر تشریف لانے کا ارادہ فرماتے ہیں اور جنابِ سکینہ مفارقتِ پدر سے بیقرار ہو کر عرض کرتی ہیں۔

نیند آئے گی جب آپ کی بُو پاؤں گی بابا　　میں رات کو مقتل میں چلی آؤں گی بابا

امامِ حسینؑ اپنی نادان بیٹی کو سمجھاتے ہیں۔

فرمایا نکلتی نہیں سیدانیاں باہر　　چھاتی پہ سُلائیں گی تمہیں رات کو مادر

وہ کہتی تھی سوئیں گے کہاں پھر علی اصغرؑ　　فرماتے تھے بس ضد نہ کرو صدقے میں تم پر

شب ہوئے گی اور دشت میں ہم ہوئیں گے بی بی

اصغر مرے ساتھ آج وہاں سوئیں گے بی بی

وہ کہتی تھی بس دیکھ لیا آپ کا بھی پیار　　میں آپ سے بولوں گی نہ اب یا شہِ ابرار

اچھا نہ اگر کیجیے گا جلد آنے کا اقرار　　مر جائے گی اس شب کو تڑپ کر یہ دلِ افگار

کیسی ہیں یہ باتیں مرا دل روتا ہے بابا

گھر چھوڑ کے جنگل میں کوئی سوتا ہے بابا

بچہ بوڑھا جوان مرد عورت جس کی زبان لکھتے ہیں گویا اس کی زبان سے باتیں کرتے ہیں اور اُسی درجے کا خیال دکھاتے ہیں۔ اس تمثیلِ ذاتی کی کسی دوسرے کے کلام میں جھلک بھی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ مقام تو مرثیہ گو معمولی واقعات سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ اس راہ کی پیچیدگی سے انسان کی عقل گم ہو جاتی اور نفسِ معاملہ لکھنے میں زبان اور لٹریچر کا عقدہ کُھل جاتا ہے قلم اس نشیب و فراز کو طے نہیں کر سکتا۔ جنابِ سکینہ کی تقریر نفس الامر میں تو وہی باتیں ہیں جو ایک چار برس کا نادان بچہ کرتا ہے مگر میر انیس نے خاندانِ امامت کے بچوں کا لٹریچر اور اس غم و غصہ میں معصومہ کی ضد اور ہٹ کے ساتھ ساتھ حفظِ مراتب کا لحاظ رکھا ہے۔ باپ نے بیٹی سے پیش آنے والے معاملے کے متعلق صرف ایک اشارہ کیا ہے اس موقع پر بچوں کے لئے ڈرانے والے خوفناک لفظوں کا استعمال نہیں ہوا مگر اس سوال و جواب میں دل و جگر کو زخمی کرنے والے نشتر اپنا کام کر گئے۔ جنابِ سکینہ کی زبان سے یہ مصرع (وہ کہتی تھی سوئیں گے کہاں پھر علی اصغر) ایک اعلیٰ درجے کا موشن ہے جس میں بچپنے کی ضد اور رشک کا پہلو پیدا ہوتا ہے اور امام علیہ السلام کا یہ جواب (فرماتے تھے بس ضد نہ کرو صدقے میں تم پر) یہ مصرعِ جواب کافی نہ ہونے کی وجہ سے کس قدر ضبط و تحمل ظاہر کر رہا ہے۔ دونوں مصرعوں کے رُخ کا ملاحظہ کیجئے تو شاعر کی نازک خیالی کا اندازہ خود بخود ہو جائے گا۔ یہ باتیں ہیں جو سوائے میر انیس کے اور کوئی نہیں جانتا یا سب جانتے ہیں اور کوئی لکھ نہیں سکتا یا لکھ سکتا ہے اور اثر پیدا نہیں کر سکتا اور آگے کے ایک بند میں تو بچپن کے خیالات اپنی زبان میں نظم فرما کر قادر الکلامی دکھاتے ہیں۔ لفظ فصاحت کو حقیقی معنوں میں صرف کرنا صرف میر انیس ہی جانتے تھے۔

اصغر کبھی ساتھ آپ کے اب تک نہیں سوئے ۔۔۔ بہلا لیا اماں نے اگر چونک کے روئے
شفقت تھی مجھی پر کہ یہ بے چین نہ ہوئے ۔۔۔ یہ پیار ہو جس پر اُسے یوں ہاتھ سے کھوئے

جیتے رہیں فرزند کہ سب لختِ جگر ہیں
ہم آپ کی بیٹی ہوں وہ اماں کے پسر ہیں

فاضل شاعر نے غضب کا بند لکھا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ بچپن کی وجہ سے مدعائے اصلی جناب سکینہ کی سمجھ میں نہیں آتا اور باپ کے اشاروں تک بیٹی کا ذہن رسائی نہیں کرتا اس لیئے ہر سوال سے چھوٹے بھائی کے رشکِ محبت اور اپنی خصوصیت کا اظہار کر کے متمنّی جوابِ شافی ہیں۔ ایسے ایسے مقام میر انیسؔ کے مرثیوں میں پڑھنے والے رَو میں پڑھ جاتے ہیں اور سُننے والے بھی معمولی توجہ سے سُن لیتے ہیں کیوں کہ یہاں فقط سلاستِ زبان کے ساتھ انسانی طبائع کے جذبات کو شاعر نے دکھایا ہے جن میں شوکتِ الفاظ کی چمک دمک نہیں پائی جاتی لیکن ان مقاموں کو اربابِ بصیرت اور صاحبانِ مذاقِ سلیم کامل توجہ سے ملاحظہ فرماتے ہیں اور سخن سنج شعرا جانتے ہیں کہ یہ وہ سخت منزل ہے جس میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ میں نے تنقیدی نوٹ لینے کو جب یہ مرثیہ ہاتھ میں اٹھایا ہے اُسی وقت میری ہمت پست ہو گئی تھی کیونکہ فاضل شاعر نے یہ تصنیف اپنی زبان کا معیار بنا دی ہے مگر میں نے تائیدِ آسمانی پر بھروسہ کر کے مقدمۂ تنقید میں ناظرین کو ایک توجہ دلائی ہے۔ اب میں وہ پردہ اٹھائے دیتا ہوں جس کے اندر بڈھے شاعر کی روح باتیں کر رہی ہے۔

"لو رؤو نہ اب صبر کرو باپ کو جانی"۔ یہ مصرعہ نہیں فصاحت کا دریا موجیں مار رہا ہے اور عالمِ اضطراب میں صابر امامؑ کی زبان سے محبتِ پدری کے آبِ حیات کا مینھ برس رہا ہے۔ زبانِ رسولؐ ہونے کی وجہ سے قرآن زبانِ عربی میں نازل ہوا اور زبانِ انیسؔ ہونے کی وجہ سے جنّت کی حوریں بھی اسی زبان میں باتیں کرتی ہوں گی۔ یہ مصرع نہ مسئلۂ فلسفہ ہے نہ کرشمۂ سائنس پھر اس کی تشریح کو کہاں سے لفظ لاؤں اور کن کتابوں کی ورق گردانی کروں۔ اے مقدّس شاعر کی پاک روح بے سرمایہ احسنؔ کی گستاخی کو معاف کرنا کہ ہوائے حسنِ ارادت کے جھونکے اِس غبارِ ناتواں کو بے ٹھکانے لیئے پھرتے ہیں۔ میر انیسؔ کے دماغ کی وہ برقی طاقت جو قلم کے ذریعے سے لفظوں میں ساری ہوتی ہے ، اڈیسن کی رگ رگ میں دوڑنے والی بجلی سے زیادہ سریع العمل ہے۔

لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کو جانی کچھ دیتی ہو عباسؑ کو پیغامِ زبانی
او دے ہیں لبِ لعل یہ ہے تشنہ دہانی ملتا ہے تو بی بی کے لیئے لاتے ہیں پانی

محبوبِ الٰہی کے نواسے ہیں سکینہؑ
ہم بھی تو کئی روز سے پیاسے ہیں سکینہؑ

بچوں کے بہلانے کے لیے جو کچھ باتیں کی جاتی ہیں وہ سب ہیں مگر امام جھوٹ نہیں بولتا اس لیئے فرماتے ہیں (ملتا ہے تو بی بی کے لیے لاتے ہیں پانی)

پانی دستیاب ہونے کی قید مرتبۂ امامت کی صادق الاقراری ظاہر کرتی ہے۔ فاضل شاعر کے اس مصرعہ نے اِس واقعے کے نتیجے پر روشنی ڈالی ہے یعنی امام حسینؑ کی یہ حسرت پوری نہ ہوئی اور جنابِ سکینہؑ کی تشنگی کا فیصلہ قیامت پر اٹھا رکھا گیا۔

واقعاتِ عالم

دنیا ہے یہ شادی ہے کبھی اور کبھی آلام راحت کی کبھی صبح مصیبت کی کبھی شام
یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام وہ دن گئے کرتی تھی جو اس سینے پہ آرام

ضد کر کے نہ اب باپ کو رو رو کر بی بی
جب ہم نہ ہوں تم خاک پہ سویا کرو بی بی

میر انیس کے قلم کی گردش میں امام حسینؑ کے اضطرابِ قلب کی حرکت بھری ہے۔ ایک ایک لفظ دردِ رسیدہ دل کی بے چینی کا گواہ ہے۔ یہ دنیا کے اسکول کے وہ سبق ہیں جو ہر انسان کے کورس میں داخل ہیں۔ اس شاعر نے اپنی روشن خیالی سے قوم کی راہنمائی کی ہے اور قیمتی تعلیم دے گیا ہے۔

اب وہ وقت ہے کہ سید الشہدا اہلِ بیتؑ سے رخصت ہو کر میدانِ جنگ میں تشریف

لائے ہیں۔ یہاں فصلی کیفیت کے ساتھ ساتھ فاضل شاعر نے میدانِ جنگ کی جلتی دوپہر کا نظارہ دکھایا ہے۔

وہ دوپہر اُس دشت کی وہ دھوپ کا ڈھلنا　　وہ گرم زرہ اور وہ ہتھیاروں کا جلنا
وہ گرد کا مقتل میں تنق اِلوں کا وہ چلنا　　وہ بن میں پہاڑوں سے شراروں کا نکلنا

گرمی سے فرس میں بھی نہ وہ تیز تگی تھی
پیاسے تھے حسینؑ آگ زمانے کو لگی تھی

بڑے بڑے ناولسٹ مناظرِ قدرت کی سینری دکھانے والے اور ہر گرم و سرد موسم یا خزاںؑ بہار کی فصلوں کی تصویر کھینچنے والے اپنے خیالی مضامین میں بھی یہ اثر پیدا کرنے سے مجبور ہیں جو یہاں واقعاتِ اصلی کے سادہ الفاظ میں بھرا ہوا ہے مغربی طرز کے فسانہ نگار جو صرف آفتابی کرنوں کو مختلف رنگوں میں رنگ کر دکھاتے ہیں اور اس نورانی کرہ کو اپنی شاعری کی جولانگاہ مقرر کئے ہوئے ہیں۔ ذرا میر انیسؔ کے مختصر سین پر نظر ڈالیں تو ہندوستان کی خاک سے پیدا ہونے والے اہلِ کمال کی بلند خیالی کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس وقت کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ بہت سی معلومات مشرقی دماغوں میں مغربی تعلیم سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اور مغربی اہلِ قلم کی تصنیفوں کے مطالعہ سے جدید خیالات کا ہم میں اضافہ ہوا۔ قریب قریب میرا بھی ایسا ہی خیال تھا مگر میں تو اپنی اس غلط فہمی کا اعتراف کرتا ہوں اور دوسرے صاحبوں کا خیال اُن کے انصاف پر چھوڑتا ہوں اگر اُن کی نظر علومِ مشرقی کی سیر میں وسعت حاصل کرے تو یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ الغرض امام حسینؑ اپنے مخالفوں سے اتمامِ حجت فرماتے ہیں اور اُن بے رحموں کی توجہ لاش ہائے شہدا کی طرف مائل کر کے تجہیز و تکفین کی درخواست کرتے ہیں۔

کیا اُن سے عداوت جو گئے دارِ فنا سے　　کوتاہ ہیں چلنے سے قدم ہاتھ وغا سے
مطلب انہیں دریا سے نہ کچھ کام ہوا سے　　رحم ان کا طریقہ ہے جو ڈرتے ہیں خدا سے

معاف ہیں لڑے بھی تو یہ سب حق پہ لڑے ہیں
آخر یہ بشر ہیں کہ جو بے گور پڑے ہیں

دیکھو میر انیس کا کلام محاسنِ شاعری کے علاوہ قانونِ قدرت کا سبق ہے یہ وہ ہدایات ہیں جن کی جانب شرعِ محمدی اور قانونِ حاکمِ وقت رہنمائی کرتا ہے۔

ان میں کئی بچے ہیں کہ نکلے نہ تھے گھر سے　　نازک ہیں صباحت میں زیادہ گُلِ تر سے
افتادہ ہیں اس دھوپ میں یہ تین پہر سے　　پوچھے کوئی یہ درد و الم میرے جگر سے
نرغہ ہے کہ تلواروں میں دم لے نہیں سکتا
زندہ ہوں میں اور ان کو کفن دے نہیں سکتا

کسی جگہ بحیثیت اختیاراتِ امامت تحکم نہیں ثابت ہوتا۔ ایک معمولی انسان کی طرح ہر ایک درخواست کی جاتی ہے کہ امامؑ کے صبر و استقلال کی شان دکھلانے میں فاضل شاعر نے مسئلہ جبر و اختیار کی تحلیل کی ہے۔ میر انیس کے کلام کی تاثیر سے ممکن ہے کہ رونے والے خون کے آنسوؤں سے روئیں مگر معرکۂ کربلا کے کئی لاکھ بے دردوں میں تو ایک شخص بھی ایسا نہ تھا کہ جس کا دل امامِ مظلوم کی تقریر سے متاثر ہوا ہو اور یہی میر انیس کی تخیل کا مقصود ہے اور میر انیس کے الفاظ کی برجستہ زد آج بھی وہاں تک پہنچ جاتی ہے جس مرکز کی مسافت میں تیرہ سو سال کا فاصلہ حائل ہے۔

یہ فوج ہے کیا آگ کا دریا ہو تو جھیلیں　　کیا ڈر انہیں بچپن ہیں جو تلواروں سے کھیلیں

اُلٹیں صفت کاہ اگر کوہ کو ریلیں ۔۔۔ کو فہ تو ہے کیا شام کو اور روم کو لے لیں

چاہیں تو زمیں کے ابھی ساتوں طبق اُلٹیں

یوں اُلٹیں کہ جس طرح ہوا سے ورق اُلٹیں

کہتے ہیں جسے اہلِ جہاں گنبدِ گرداں ۔۔۔ نہ در فہ ہے اک جزوِ کتابِ شہِ مرداں

ہم آج ہیں عالم میں فقط فہم و قدر داں ۔۔۔ حق بین و حق آگاہ و سخن سنج و ہُنر داں

کس امر میں تقلیدِ محمدؐ نہیں کرتے

فاقوں میں سوالِ فقرا رد نہیں کرتے

کیسے ہی غیر مانوس قافیے ہوں میر انیسؔ اپنا اندازِ فصاحت نہیں چھوڑتے۔ قافیوں کا وزن اندازِ رجز خوانی کی عظمت و جبروت دکھا رہا ہے۔ یہ مقام ہے جہاں قدرتاً "شوکتِ الفاظ" کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور فصحا اس کو یوں پورا کرتے ہیں۔

آشوبِ جنگ

نقارۂ رزمی پہ لگی چوب یکایک ۔۔۔ غل ہو گیا اُٹھا دشت پر آشوب یکایک

تلواریں کھنچیں زہر میں سر ڈوب یکایک ۔۔۔ لشکر سے بڑھے فوج کے سر کوب یکایک

رحم آیا نہ اعدا کو ولی ابنِ ولی پر

نرغہ ہوا مظلوم حسینؑ ابنِ علیؑ پر

غل طبل کا غرّا کی وہ آواز ڈرانی ۔۔۔ زہرے جسے سن سن کے ہوئے جاتے تھے پانی

کالے وہ علم شام کے لشکر کی نشانی ۔۔۔ وہ تیر جگر دوز کمانیں وہ کیانی

اک تیر سے مرجاتے ہیں عرصہ نہیں کھنچتا

رستم سے بھی جس کا کبھی چلّہ نہیں کھنچتا

دو بندوں میں آغازِ جنگ کا نقشہ کھینچا ہے اور اس کے بعد امام علیہ السلام کے حملے نے جو ہیبت اور ابتری پیدا کر دی ہے وہ عالم دکھاتے ہیں۔

تلوار اِدھر سیّدِ ابرار نے کھینچی — یا تیغِ دو سر حیدرِ کرّار نے کھینچی
تصویر اجل برقِ شرربار نے کھینچی — گردن طرفِ غار ہر اک مار نے کھینچی
گھبرا گئے صدمہ یہ ہوا روحِ امیں پر
سر رکھ دیئے جھک جھک کے پہاڑوں نے زمیں پر

اوّل درجے کی خوبی یہ ہے کہ خوبصورت اور مشکل ردیفیں پیدا کر کے قریب قریب پورا مرثیہ بقیدِ قافیہ و ردیف نظم فرماتے ہیں اور ردیفوں کا اثبات و ربط باوجودِ سنگلاخ زمینوں کے وہ بے تکلفی دکھاتا ہے جو کوئی فصیح نثر میں بھی نہیں لکھ سکتا۔

تعریفِ شمشیر

تلواریں جو عاری تھیں تو بے آب سنانیں — بے کار کمیں میں تھیں کمینوں کی کمانیں
اک منھ میں اُسے حق نے جو دو دی تھیں زبانیں — اس رمز کو جو سیف زباں ہوں وہی جانیں
مطلب یہ تھا اب دین کو کامل یہ کرے گی
وہ شرک کو اور کفر کو باطل یہ کرے گی

مناسباتِ لفظی اور لوازمِ شاعری میں فروگذاشت نہیں ہوتی۔

جو سایۂ شمشیر ظفر یاب میں آیا — ماہی کی طرح موت کے قلّاب میں آیا
فی الفور خلل زیست کے اسباب میں آیا — جو آ گیا کاوے کے وہ گرداب میں آیا
کچھ مطلب دل ہاتھ کے مارے سے نہ نکلا
دریائے دمِ تیغ کے دھارے سے نہ نکلا

سایۂ شمشیرِ ظفریاب کی بلاغت کو فصاحت کا زیور پہنا دیا ہے۔ چوتھے بند سے بیت کا تعلق میر انیس کی شان ہے۔

سیدھے جو نشاں تھے انھیں کیا تیغ سے الٹا　　اِس صف کو بچھا کر وہ پڑا تیغ سے الٹا
لشکر کا ورق وقتِ وغا تیغ سے الٹا　　گردن بھی الگ تھی جو گلا تیغ سے الٹا
جو صاحبِ دفتر تھا وہ مقتل سے ہٹا تھا
جس فرد کے چہرے پہ نظر کی وہ کٹا تھا

چاروں مصرعوں میں ربطِ ردیف کی مشکل کو فصاحتِ زبان کے تیزاب سے پانی کر دیا ہے اور بیت میں تو صنعتِ مراعات النظیر کا امتیاز ہی نہیں ہو سکتا۔ تمام الفاظ جو لوازمِ صنعت ہیں وہ ضروری معلوم ہوتے ہیں نہ بغرضِ اظہارِ علمِ صنائع۔

سر کاٹ دیا فرق پہ جس حال میں پہنچی　　چہرے پہ جو گھوڑے کے پڑی یال میں پہنچی
بجلی تھی کہ جوشن کے کبھی جال میں پہنچی　　پہنچے کے اُڑانے کے لئے ڈھال میں پہنچی
سمجھا یہ ہر اک برق گری دشمنِ دیں پر
پنجہ تھا سپر میں تو کلائی تھی زمیں پر

اعضائے سوارانِ تنومند جدا تھے　　نیزے تو ہیں کیا جسم کے سب بند جدا تھے
بیٹوں سے پدر باپ سے فرزند جدا تھے　　کیا وصل ہے پیوند سے پیوند جُدا تھے
تنہا نہ سرِ اہلِ ستم کاٹ دیے تھے
تلوار نے رشتے بھی بہم کاٹ دیے تھے

اس قدر مرثیوں کی تعداد اور اِس تواترِ معاملہ بندی پر تشبیہ و استعارات کی جدت ہر جگہ موجود ہے اور پھر کس افراط سے کہ جوشِ مضامین کی آندھیاں چل رہی ہیں۔

جو برچھیاں بے پھل تھیں وہ خجلت سے گڑی تھیں　　عاری تھیں وہ تلوار سے تیغیں جو لڑی تھیں
تھیں کُند سنانیں وہ جو نیزوں سے کڑی تھیں　　جوشن پہ بھی کڑیاں کبھی ایسی نہ پڑی تھیں

ریتی پہ کٹی ڈھالوں کا پشتارا ہوا تھا
ہر پارۂ چار آئینہ صد پارا ہوا تھا

گھوڑے کی تعریف

آہو جو کہوں اُس کو تو آہو ہے چکارا
ساتھ اُس کے ہُما کو نہیں پرواز کا یارا

وہ نعل، وہ ہر کیل وہ سُم معرکہ آرا
پتلی وہ پری سمجھے جسے آنکھ کا تارا

دیکھی ہے سُموں میں کسی گھوڑے کے یہ ضو بھی
اک جا ہیں ستارے بھی قمر بھی مہِ نَو بھی

تلوار کے مانند نہ بھرتا تھا دَم اُس کا
گردن وہ مہِ نَو سی وہ منکے کا خم اُس کا

دریا سے روانی میں فزوں تر قدم اُس کا
کس طرح لکھے وصف کمیت قلم اُس کا

دوڑاؤں کہاں تک فرسِ ذہنِ رسا کو
کہہ دے کسی شاعر نے جو باندھا ہو ہوا کو

یہ مضامین عرشِ معلیٰ سے آتے تھے اور یہ محاسن قابلِ تنقید و تعریف نہیں ہیں کیوں کہ لوگوں کی نگاہوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔

اُس صف کو اُلٹ کر ادھر آیا اُدھر آیا
فوجوں سے پلٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا

بجلی سا سمٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا
جوں شیر جھپٹ کر اِدھر آیا اُدھر آیا

تھمتا ہے چھلاوہ بھی مگر یہ نہیں تھمتا
طائر بھی ٹھہر جاتا ہے پر یہ نہیں تھمتا

جو رگ ہے عوض خون کے سُرعت سے بھری ہے
جلدی جو ہے سب جلد بھی جودت سے بھری ہے

شعلے کی طرح طبع شرارت سے بھری ہے
اُبلی ہوئی ہر آنکھ شجاعت سے بھری ہے

اُڑ جاتا تھا برچھیوں وہ محل جست کا پا کے
تلواروں کے نیچے سے نکل جاتا تھا آ کے

پامال نہ ہوں پھول جو گلزار پہ دوڑے
سُم تر نہ ہوں گر قلزم زخار پہ دوڑے
اِس طرح رگِ ابرِ گہر بار پہ دوڑے
جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

اغراق ہے یہاں کچھ نہ تعلّی شعرا کی
کافی ہے یہ تعریف کہ قدرت ہے خدا کی

صرف چار ہی بند گھوڑے کی تعریف ہیں کافی سمجھ کر یہ باریکی دکھاتا ہوں کہ اس میں کس قدر جدید تشبیہیں ہیں۔ ایک پہلوانِ شامی امام حسینؑ کے مقابلے کو آیا ہے اُس کی تصویر کھینچتے ہیں۔

پہلوانِ شامی کی تصویر

سر طبلکِ معکوس جبیں حد سے فزوں تنگ
غدّار و سلمشور و جفا پیشہ و سرہنگ
کہنے کو بشر پر قد و قامت کا نیا ڈھنگ
حیراں شبِ ظلمات ہو یہ تیرگیِ رنگ

پہلے سے یہ کالا تھا منھ اُس دشمنِ رب کا
بن جائے توا عکس سے آئینہ حلب کا

مصرع اوّل میں علمِ قیافہ کے اعتبار سے وہ فیچرز دکھائے ہیں جن کے لئے غدّاری سلمشوری اور جفا پیشگی کی ضرورت ہے۔ میر انیسؔ کی معلومات غیر محدود ہے اُن کا آفتابِ کمال زمینِ شاعری کے ذرہ ذرہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ دوسرے بند میں اُس کے حلیے کو ختم کیا ہے جس سے خونخواری اور جرائم پیشگی کے آثار نمایاں ہیں۔

لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منھ قیر سا کالا
شب ایک طرف دن کو ڈرے دیکھنے والا
قد دیو کے قامت سے بلندی میں دو بالا
دانتوں کی کبودی دہنِ مار کا چھالا

شیر اُس کی صدا سُن کے لرز جاتے تھے بن میں
فاسد تھی ہوا ان کی وہ بدبو تھی دہن میں

یہاں فاضل شاعر نے صنعتِ ہجو کا رنگ دکھایا ہے جو داخلِ اصنافِ شاعری ہے اور کوئی صنفِ شاعری مبالغہ سے خالی نہیں کیوں کر مبالغہ خود ایک صنعت ہے۔ ایسے موقعوں پر نادانوں نے میر انیس پر جھوٹے مضامین نظم کرنے کا الزام لگایا ہے مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مرثیہ کا حرف حرف کتبِ تاریخ و حدیث کا ترجمہ نہیں ہے۔ یہاں حق کے مقابل میں ایک کافر کی ہجو ہے اور صاحبِ حق بھی کون یعنی امام۔ پس مخالف و معاندِ امام علیہ السلام وہی لوگ تھے جن کی طبیعتیں شیطنت و دغا مکر و فریب سے بھری ہوئی تھیں اور وہ کمینے انسان جن کے دلوں کی روشنی کفر و الحاد کی تیرگی نے فنا کر دی تھی اُن پر ایک معمولی انسان بھی نفرت و حقارت کی نظر ڈالتا تھا شاعر نے اپنی طبعی نفرت کو جذباتِ شاعری کے ذریعے سے ظاہر کیا ہے۔ جرائم پیشگی ایسے مکاروں کے حلیے میں نفرت ناک تغیر پیدا کر دیتی ہے اور ارتکابِ گناہ قدرتاً انسان کی ماہیت بگاڑ دیتا ہے۔ کسی قاتل کو دیکھو وہ عملِ قتل سے پیشتر خواہ کیسا ہی خوبصورت انسان ہو مگر جرمِ قتل واقع ہونے کے بعد وہی آنکھیں جو فتح مندانہ اشارات سے بھری ہوتی ہیں خونِ ناحق کی جھلکیوں سے بے رونق ہو کر گڑھے میں گھس جاتی ہیں اور گناہوں کا سیاہ پوڈر اُس کے خوشنا چہرے کو بھیانک کر دیتا ہے۔ پس شاعر نے یہاں وہی جذبات دکھائے ہیں جو خونی اور دغا شعار لوگوں کے چشم و ابرو کے اشاروں میں مخفی ہوتے ہیں۔ الغرض اس کے بعد پہلوان کی جنگ ہے اور امام علیہ السلام نے اُس کو جہنم واصل کر کے نعرۂ تکبیر بلند کیا ہے جو اسلامی فتح مندی کی نشانی ہے۔

تکبیر کا نعرہ جو کیا آپ نے تن کے — صاف آئی صدا بیچ سے یہ چرخ کہن کے
اے لختِ جگر بادشہِ قلعہ شکن کے — لڑتے ہیں یوں ہی فوج سے جو شیر ہیں رن کے

تو صبر میں ایوب ہے خوش انجام ہے شبیر
اب سجدے میں جھک عصر کا ہنگام ہے شبیر

مسئلہ تسلیم و رضا

سُن کر یہ صدا آپ نے تلوار کو روکا — تلوار کو کیا برقِ شرر بار کو روکا
گردوں کی طرف دیکھ کے رہوار کو روکا — بے چین تھا پر اسپِ وفادار کو روکا
فرمایا کہ جینے سے دل اب تنگ ہے گھوڑے
تھم جا کہ بس اب خاتمۂ جنگ ہے گھوڑے

یہ بھی ایک سین ہے اور چاروں مصرعوں میں موشنس بھرے ہوئے ہیں خصوصاً تیسرا مصرعہ ایک عالمِ خاص کی تصویر ہے۔

عاشق کو نہیں دوریِٔ معشوق گوارا — سر جلد کٹاؤ یہ ہے خالق کا اشارا
مشتاقِ اجل ہے اسد اللہ کا پیارا — اب خنجرِ بے آب ہے اور حلق ہمارا
طالب ہوں رضامندیِ ربِ دوسرا کا
صد شکر کہ وقت آگیا وعدے کی وفا کا

جو شجاع مجاہد جوانانِ بنی ہاشم کے خونِ ناحق کا انتقام لے رہا ہو اور انتہائے غیظ و غضب میں اُس کی تلوار سر و تن کا فیصلہ کر رہی ہو، کیا وہ اپنے جذباتِ شجاعت و اشتعالِ طبع پر غالب آسکتا ہے بالکل منافیِ عقل ہے۔ مگر امام حسینؑ کا ہر ارادہ وابستۂ حکمِ الٰہی تھا۔ جہاد یا ترکِ جہاد دونوں حالتوں میں وہ اپنی نفس پر قدرت رکھتے تھے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو روزِ عاشورہ کی خطرناک جنگ سلسلۂ عالم کو قطع کر دیتی مگر اُن کے ارادے قدرت نے محدود کر دیئے اور وہ اُن احکام کے پابند تھے جو قدرت کے دستور العمل میں روزِ ازل داخل ہو چکے تھے۔ بس اب یہ دیکھنا ہے کہ امام کے خیالات دکھانے میں فاضل شاعر کو کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اور یہ بات جوہر شناسوں کی نظروں سے انشاء اللہ پوشیدہ نہ رہے گی۔ فقط اس مصرع کو ایک مرتبہ اور پڑھیے

اور اُس عالم کا نظارہ کیجئے دگردوں کی طرف دیکھ کے رہوار کو روکا۔

بے حال ہیں رہوار پہ آقائے خوش اوقات　　بند آنکھیں ہیں خوں بہتا ہے کی جاتی نہیں بات
سر پیٹتے ہیں اہلِ حرم لُٹتے ہیں سادات　　حامی نہیں کوئی کوئی پُرساں نہیں ہیہات

حالِ شہِ آوارہ وطن دیکھ رہی ہے
تلواروں میں بھائی کو بہن دیکھ رہی ہے

یہاں فاضل شاعر نے امامِ مجروح و مظلوم کی تصویر کھینچی ہے۔ درحقیقت میر انیسؔ کی شاعری قلب و جگر کے اُن تاروں پر مضراب کا کام کرتی ہے جس میں درد و غم کا سریلا نغمہ بھرا ہوا ہے۔ واقعاتِ اصلی کے بیان کرنے کو میر انیسؔ سے بہتر لفظ کسی کو نہیں ملے چھٹے مصرع سے کیا حسرت و یاس مترشح ہے کہ عاشقِ زار بہن اپنے مظلوم بھائی کو اُس حالت میں دیکھ رہی ہے جب کہ چاروں طرف فوجِ شام کی خونخوار تلواروں کا ابر چھایا ہوا ہے۔

اُس حشر میں احمدؐ کی نواسی کا تھا یہ حال　　گرتی تھی کبھی اٹھتی تھی کھولے ہوئے بال
چلاتی تھی سر پیٹ کے اے فاطمہؑ کے لال　　ہے ہے تمہیں تلواروں میں گھیرے ہیں بدفعال

کیا کیا مجھے صدمے یہ جدائی نہیں دیتی
لاش آپ کی زینبؑ کو دکھائی نہیں دیتی

چھٹے مصرع کی حسرت ناک لفظوں میں دو پہلو پیدا ہوتے ہیں یا یہ کہ کثرتِ غم و انتشارِ مزاج سے قوتِ بینائی زائل ہو گئی یا ایک مظلوم شہید کی لاش پر اس کثرت سے تلواریں کھنچی ہیں کہ لاش کا دکھائی دینا محال ہے۔ میر انیسؔ کے گلزارِ شاعری کی بوقلمونی ہر رنگ میں اپنی دلفریبی دکھاتی ہے۔ مرثیے کا آغاز و انجام سنجیدہ خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ جنابِ زینبؑ نے خیمے سے نکل کر قرینے سے دریافت کیا ہے کہ جہاں ہجومِ فوجِ شام اور تلواروں کی کثرت ہے وہیں سیدالشہداؑ زخمی ہو کر گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے ہیں اور یہ خیال اُوپر کے اس مصرع سے پیدا ہوتا ہے (تلواروں میں بھائی کو بہن دیکھ رہی ہے) یعنی تلواروں کے

ہجوم میں بھائی کی لاش کا ہونا قیاس کیا گیا ہے مگر اب تک بھائی کی لاش پر بہن پہنچ نہیں سکی کیوں کہ دوسرے بند میں شاعر نے اِس کنایہ کی صراحت کردی ہے۔

لاش آپ کی زینبؑ کو دکھائی نہیں دیتی

استغاثۂ معصومہ

ہیں کس کو پکاروں کہ ترس یاں سے یہ کھاؤ
لی جن سے زمیں مول انہیں لوگوں کو بلاؤ

اے اہلِ زراعت تمہیں امداد کو آؤ
لُٹتی ہوئی کھیتی کو محمدؐ کی بچاؤ

کام آؤ غریبوں کے تو احساں ہے تمہارا
یہ بے وطن اس دشت میں مہماں ہے تمہارا

جنابِ زینبؑ کے اس استغاثہ سے عجب حسرت و بے کسی ٹپک رہی ہے اور فاضل شاعر نے جوشِ محبت میں مضطربانہ کیفیت دکھائی ہے۔ یہ سمجھ کر کہ عالمِ غربت میں امام حسینؑ کا کوئی شریکِ حال نہیں۔ اہلِ زراعت یا اہلِ قریہ کی طرف خطاب کرنا گویا ایک سخت مجبوری اور بے حد مایوسی ثابت کرتا ہے۔ مجبوروں اور مایوسوں کا خیال ایسے اضطراب کے وقت کہاں کہاں منتقل ہوتا ہے۔ شاعر نے یہ بات دکھائی ہے۔ صاحبِ غیرت امام اپنی بہن کی آواز سُن کر بے چین ہو گئے ہیں۔

خاندانِ امامتؑ کی غیرت

شہؑ نے جو سُنی زاریِ زینبؑ تہِ خنجر
گھبرا کے صدا دی کہ اِدھر آؤ نہ خواہر

کیا قہر ہے تم رن میں چلی آئیں کُھلے سر
مشغول ہے اُمت کی دُعا میں یہ برادر

مطلوب رضا مندیٔ معبود ہے زینبؑ
تنہا نہیں اللہ تو موجود ہے زینبؑ

فاضل شاعر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قتل کی سختی سے زیادہ امام غیور کو اپنی مضطرب الحال ہمشیر کی بے پردگی کی تکلیف تھی صرف اتنا ہی نہیں کہ حضرت نے پکار کر اس موقع پر جناب زینبؑ کو آنے سے روکا ہے بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ بے چین ہو کر امام غیور نے اُٹھنے کا ارادہ کیا ہے مگر بے رحم قاتل کا منحوس زانو مقدس سینے پر پہنچ چکا تھا۔

کس طرح اُٹھوں سینۂ زخمی پہ ہے جلاد
نانا مجھے گود ہی میں لئے کرتے ہیں فریاد
اماں مرے پہلو میں ہیں لے زینبؑ ناشاد
روتے ہیں بڑے بھائی بھی یہ دیکھ کے بیداد

گریاں و حزیں خاصۂ قیوم کھڑے ہیں
بابا بھی سرہانے مرے مغموم کھڑے ہیں

امام مظلومؑ کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب بزرگوار ہنگام قتل میرے پاس ہیں۔ اب تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔ مگر وہ بہن جو بھائی کی عاشق ہے اُس کو تاب کہاں کہ اس بیکسی میں اب بھائی کے سرہانے نہ ہو۔

یہ سُنتے ہی دوڑی طرف لاش وہ مضطر
چلائی کہ ہمشیر بھی آتی ہے برادرؑ
لاشے پہ نہ پہنچی تھی کہ برپا ہوا محشر
دیکھا کہ لئے جاتا ہے قاتل سرِ سرورؑ

سب تیر اُسی طرح سے سینے میں گڑے ہیں
اور جلتی زمیں پر شہِ مظلومؑ پڑے ہیں

ہاں پیٹ کے سر روئیں وہ جو اہل عزا ہیں
یاں احمدِ مختارؐ بھی سرگرم بُکا ہیں
مقتل میں کھلے سر حرم شیرِ خدا ہیں
خاک اُڑتی ہے جنبان طبق ارض و سما ہیں

سر کٹ چکا لختِ دلِ زہراؑ و علیؑ کا
اب لُٹتا ہے ملبوس حسینؑ ابنِ علیؑ کا

بھاگا ہے کوئی لے کے عبائے شہِ ذیجاہ　　عمامۂ حضرت لئے جاتا ہے کوئی آہ

عریاں ہے زمیں پر تنِ فرزند ید اللہؑ　　ہاتھوں سے قبا کھینچ رہا ہے کوئی گمراہ

اب لشکرِ کیں فوج کو پامال کرے گا

بعد اس کے ستم ہاتھوں یہ جمال کرے گا

صنفِ مرثیہ کی علتِ غائی پر نظر کرنا چاہیے۔ میر انیسؔ مرثیہ کے ارکان کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ابتدا سے انتہا تک ایک زوردار طبیعت کا جوش کم ہونے نہیں پاتا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ ایک ہی فکر میں ایک ہی وقت میں تمام کر دیا ہے۔ یہاں شہادتِ امام حسینؑ لکھنے میں واقعاتِ حدیث کی پابندی پورے طور پر کی گئی ہے اُن مضامین کو اس نظم میں بالکل داخل نہیں کیا جو ذاکروں نے فی الحال اعانتِ گریہ و بُکا کے لئے اختراع کئے ہیں جن پر احادیثِ وضعی کا اعتراض کیا جاتا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ میر انیسؔ کے کلام پر نقادی کچھ آسان کام نہیں ہے فلسفہ اور سائنس کے مہتم بالشان مسائل کو حل کرنے کے لئے اکتسابی قابلیت کی ضرورت ہے اور انیسؔ کے پُر اسرار مضامین سمجھنے کو قدرتی مذاق درکار ہے نہ یہ گریجوئیٹ کا کام ہے نہ علماء کا حصہ ہے جس وقت تک وہاں سے مذاقِ سلیم و قوتِ امتیازیہ عنایت نہ ہو جہاں سے میر انیسؔ کو یہ نعمت عنایت ہوئی تھی ؂

ہے سہلِ ممتنع یہ کلامِ ادق مرا

برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

آخر میں میرا یہ ارادہ تھا کہ فردوسی و نظامی وغیرہ کے کلام سے میر انیسؔ کے کلام کا موازنہ کر کے پبلک میں پیش کروں مگر جناب اشہری نے اپنی کتاب میں اس کمی کو پورا کر دیا ہے اس لئے لکھی ہوئی باتوں کا مکرر لکھنا غیر ضروری ہے۔

—

1906-1993

دیگر مطبوعات

سخن وران مجلس افروز (شاد عظیم آبادی
کے قلم سے مرثیہ نگاروں
کے حالات)

محفل اعجاز (مراثی سید حسن رضا مرحوم)
بزم ناظم (مراثی ناظم الہند سید ناصر حسین ناظم)
ضیائے کاظم (مراثی سید کاظم علی کاظم میرٹھی)
ریاض خلد (مراثی میر ریاض الدین ریاض)
افراد غم (مراثی سید محمود حسن عقیل)
جام کوثر (مراثی سید مظفر علی خاں کوثر)
اعجاز انیس (میر انیس کے سلاموں کا مجموعہ)
عرفان عارف (سید علی محمد عارف کے مراثی کا مجموعہ)
رنگ شہادت (بیال ویزدانی کے عزائیہ کلام کا مجموعہ)
قندیل حرم (بیال ویزدانی کی نعتوں کا مجموعہ)
جہاد علمدار (مرثیہ مرزا جعفر علی فصیح)
سید التاریخ (تاریخ سادات بارہہ مولفہ
سید روشن علی مرحوم)
سیدان بادشاہ گر (تاریخ فرح بخش کی بنیاد پر)
رقعات خطب الملک (فارسی متن مع اردو ترجمہ)
جنگ نامہ سید عالم علی خان (مصنفہ غضنفر حسین)

شاہکار مطبوعات

آبروئے وفا (مرثیہ) ظہیر الدین حیدر ۵/-

اعزازِ نفس (مرثیہ) ظہیر الدین حیدر ۱۰/-

رنگِ شہادت (مرثیہ) حضرتِ بیاں یزدانی مرتبہ: ڈاکٹر صفدر حسین ۷/۵۰

چراغِ مصطفوی (مرثیہ) ڈاکٹر صفدر حسین ۷/۵۰

محفلِ اعجاز (مجموعہ مسدس مراثی) مصنفہ: سید حسن رضا حسنی مرحوم، مرتبہ: ڈاکٹر سید صفدر حسین ۷/۵۰

جلوۂ تہذیب (مرثیہ)، ڈاکٹر سید صفدر حسین ۶/-

شاہکارِ انیس (کلامِ انیس بہ ترتیبِ نو)، مرتبہ: ڈاکٹر سید صفدر حسین ۲۱/-

واقعاتِ انیس مؤلفہ: مہدی حسن احسن لکھنوی، مقدمہ: ڈاکٹر سید صفدر حسین ۲۰/-

مرثیہ بعد انیس (تنقیدی جائزہ)، ڈاکٹر سید صفدر حسین ۷/-

پیمبرانِ سخن (مرثیہ نگاروں کے حالات)، مؤلفہ: شاد عظیم آبادی، مرتبہ: ڈاکٹر سید صفدر حسین ۲۰/-

عرفانِ جمیل (مجموعہ مراثی و قصائد)، جمیل مظہری ۶/-

آئینِ وفا (مرثیہ)، ڈاکٹر سید صفدر حسین ۶/-

بزمِ ناظم مصنفہ: ناظم الہند سید ناظر حسین ناظم، مرتبہ: ڈاکٹر سید صفدر حسین ۱۵/-

سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور